POCKET BOOK

89



لیڈیز کلب

1/-

کرشن چندر



کرشن چندر

وہ حسین شامیں ــــــــ

وہ سرسراتے ہوئے ریشمی ملبوس ــــــــ

وہ لونڈرا اور ایوننگ ان پیرس کی خوشبوئیں۔

وہ رقص اور رقاصائیں ــــــــ

وہ بال روم ــــــــ

وہ آرکسٹرا کی دھن پر تھرکتے پاؤں ــــــــ

وہ "آتشِ بے دود" ــــــــ

کلب کی یہ زندگی جیسے حسین ترین زندگی ہو۔ لیکن اس زندگی کا دوسرا رُخ کیا ہے۔ ؟ یہ عظیم مصنف کرشن چندر کے "بوربن کلب" میں دیکھئے ــــــــ







1/-

مشورہ بکس





بوربن کلب

ناول کرشن چندر



مشورہ بک ڈپو

رام نگر۔گاندھی نگر۔پوسٹ بکس ۱۶۳۹/ دہلی ۶



قیمت فی کتاب ایک روپیہ

ناشران :- مشورہ بکڈپو

رام نگر۔ گاندھی نگر۔ پوسٹ بکس ۱۶۳۹، دہلی ۶

مطبوعہ :- دہلی پرنٹنگ ورکس

BAURBAN CLUB—KRISHAN CHANDER

NOVEL

پرنس فیروز

اولڈ بوربن کلب بمبئی کی سب سے اونچی کلب مانی جاتی ہے۔
نہ صرف اس لئے کہ وہ بمبئی کی سب سے اونچی جگہ ملبار پہاڑی
پر واقع ہے بلکہ اس لئے بھی کہ بوربن کلب کے ممبر سب سے
اونچی حیثیتوں کے مالک ہیں۔ معمولی لکھ پتیوں کی تو مجال کیا
ہے۔ عام قسم کے کروڑپتی بھی جنہوں نے آج کل میں سرکاری
ٹھیکوں سے یا کسی نئے پلانٹ سے سو دو سو لاکھ روپے
بنا لئے ہیں، اِس کلب کے ممبر نہیں ہو سکتے۔ اس کلب کے ممبر
ہونے کے لئے خاندانی وجاہت اور شرافت اور نجابت
روپے کے ساتھ ساتھ دیکھی اور پرکھی جاتی ہے۔ اس کلب
کے بیشتر ممبر وہ لوگ ہیں جو سات پشتوں سے کروڑپتی چلے
آرہے ہیں۔ یا پُرانے رؤسا اور شُرفا کے خاندانوں کے
لوگ اور عزیز واقارب۔ سونا جن کی گھُٹی میں پڑا ہے اور

جن کی پُرانی بلڈنگوں سے ہزاروں روپے ماہانہ کا کرایہ اُنہیں وصول ہوتا ہے۔ یا پُرانے راجگان اور نواب جو اپنے پُرانے وسیع اختیارات سے دست بردار ہو کر اب اِس کلب کے کمروں میں عزلت نشین ہیں۔ اِس کلب کا ممبر بن جانا تو بہت بڑی بات ہے کسی ایک شام کے لئے یہاں مدعو ہو جانا یا کِسی ممبر کا مہمان بن کر چلے آنا اُس فرد کو بمبئی کی بہترین سوسائٹی میں اچھّی طرح متعارف کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کلب کے ممبر صرف ایک سو ہیں۔ اس تعداد میں ایک کا بھی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

اس کلب کی عالی شان محل نُما عمارت اپنے مرمریں ستونوں اور سُرخ پتھّر کی بُرجوں کے ساتھ ملبار ہل کی چوٹی پر واقع ہے۔ جہاں خوبصورت چھتے ہوئے برآمدوں کی جالیوں پر پھول دار بیلیں جڑی ہوئی ہیں۔ اور چھت کے گہرے دبیز غالیچوں والے کمروں میں مدھم مدھم روشنیوں والے فانوس اور سفید اچکنیں پہننے والے خُدّام مؤدّب جھکے ہوئے، انسانی عیش و آرام، شخصی تحمّل، حسُن سلیقہ اور تزک و احتشام کا ایسا باوقار نمونہ پیش کرتے ہیں جو دوسری کلبیں اپنے ممبراراکین کے لئے پیش کرنے سے قطعی طور پر قاصر ہیں۔

پرنس فیروزچند تقریباً پندرہ سال سے اِس کلب کے ممبروں میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ اِس قدر اپنی دولت کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی شخصی وجاہت کے اعتبار سے وہ ممبروں میں بے حد مقبول اور پاپولر ہیں اُن کی عُمر کوئی پینتالیس برس کے قریب ہوگی۔ مگر اپنے سلیقے اور جسم کے رکھ رکھاؤ کے اعتبار سے وہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ کے نہیں دکھائی دیتے۔ اُن کے لانبے مگر مضبوط جبڑوں والے سانولے چہرے پر چھوٹی چھوٹی خوش نُما مونچھیں عجب بہار دیتی ہیں۔ اُن کے لانبے قد اور متناسب جسم کی جامہ زیبی، اُن کی دل کش مُسکراہٹ اور دلچسپ باتیں بالخصوص اُنہیں عورتوں کے طبقے میں بے حد مقبول بنا دیتی ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع پر بے تکان مسلسل گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور اُن کی گفتگو نہایت اونچے معیار کی اعلیٰ پائے کی پُر مغز اور معلوماتی ہوتی ہے۔ اُن کی بڑی بڑی بادام کی سی صورت والی آنکھیں زندگی کا گہرا تجربہ، سمجھ، درس اور معانی لئے ہوتی ہیں۔

پرنس فیروزچند کیا کرتے ہیں، اِس کے متعلق کسی کو وثوق سے کچھ معلوم نہیں ہے۔ سُنا ہے کہ وہ شمالی ہند کے کسی پُرانے رجواڑے کے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جنہیں بچپن ہی سے انگلینڈ میں تحصیل علم کی خاطر بھیج دیا گیا تھا۔ بچپن سے

شباب تک اور آکسفورڈ سے پیرس تک وہ جانے کس قسم کا علم حاصل کرتے رہے کہ اُن کے سرپرست نے اُنہیں عاق کر دینا مناسب سمجھا۔ کوئی کہتا ہے کہ اُنھوں نے اپنے خاندان والوں کی مرضی کے خلاف لندن اور پیرس میں یکے بعد دیگرے دو تین شادیاں کر ڈالی تھیں۔ جس کی بنا پر اُن کے خاندان والوں نے اُن سے ایسا سلوک کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ کسی غیر ملکی سفارت خانے کے کسی اُلجھاوے میں اِس بُری طرح گرفتار ہو گئے تھے کہ سرکار انگلشیہ کے دباؤ پر اُن کے خاندان والوں نے ایسا کیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اُنھوں نے لندن میں شاہی خاندان کی دور پار کی رشتے دار خاتون کی شان میں گُستاخی کی تھی جس کی بنا پر اُن پر یہ عتاب نازل ہوا۔ کوئی کہتا ہے کہ لندن کی ایک حسین ویٹرس کے چکر میں آکر انھوں نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک سِرے سے کسی رجواڑے کے خاندان سے متعلق نہ تھے۔ بلکہ عرصہ دراز سے پیرس میں جلیبیاں بیچتے چلے آ رہے تھے۔ اِس کام میں وہ اس قدر دولت مند ہو گئے کہ چند سال بعد ہی اُنھوں نے پیرس کے کاروبار کو ترک کر کے بمبئی میں ایک نئی اور باوقار حیثیت سے دوسری زندگی شروع کر دی۔ کوئی کچھ کہتا

ہے، کوئی کچھ۔ مگر یہ امر بلا شبہ ہے کہ پرنس فیروز چند کا ماضی کسی قدر پُر اسرار ہے۔ جس نے اُن کی شخصیت کو عورتوں کی نظر میں اور بھی جاذبِ نظر اور دلچسپ بنا دیا ہے اور قیاس غالب ہے کہ وہ شمالی ہند کے کسی نہ کسی عالی نسب خاندان سے ضرور متعلق رہے ہوں گے۔ ورنہ انگریزوں کے زمانے کا گورنر اولڈ بوربن کلب کی ممبری کے لئے اُن کی سفارش کیسے کرتا؟۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بمبئی میں آکر پرنس فیروز چند بے حد ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے۔ ملبار ہِل پر اُن کی عالیشان کوٹھی تھی۔ جہاں دِن رات ہائی سوسائٹی کے افراد مدعو ہوتے تھے۔ جہاں وہسکی پانی کی طرح بہتی تھی اور پانی صرف باتھ روم کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ جہاں نت نئے فیشن کی گاڑیاں، نِت نیا فیشن کرنے والی خواتین و حضرات کو لے کر آتی تھیں۔ خود پرنس فیروز چند گاڑیوں کے معاملے میں بے حد محتاط تھے۔ اُن کی رولز رائس بمبئی کی سب سے پُرانی رولز رائس مانی جاتی ہے۔ سُنتے ہیں ڈچز آف آرک شائر اُن پر مرمٹی تھیں اور اُنھوں نے یہ گاڑی اُنہیں تحفے میں دی تھی۔ اِس کے علاوہ پرنس فیروز چند کے پاس اودی چِتّیوں والی ایک پے کارڈ تھی۔ اور پورے

بمبئی میں یہی ایک پے کارڈ تھی جو ادری چتّیوں والی تھی۔ یوں تو آج کل ہر کس و ناکس جس نے دس بارہ لاکھ کسی فلم سے یا کسی سمگلنگ سے کما لئے ہیں، ایک پے کارڈ لئے گھومتا ہے۔ یا شورلٹ پر جان دیتا ہے۔ مگر اددی چتیوں والی پے کارڈ کی بات کہاں پیدا ہوسکتی ہے۔ ایسی پے کارڈ رکھنے اور پرکھنے کے لئے دولت کے علاوہ نجیب الطرفین ہونا بھی لازمی ہے۔

تمام بڑے آدمیوں کی طرح پرنس فیروز چند کی ایک کمزوری تھی۔ عورت! خوبصورت عورت کو دیکھ کر وہ خدا کی قدرت کے قائل ہو جاتے۔ جس کے حُسنِ تخلیق اور حسنِ انتظام دونوں ہی پر اُنہیں شبہ تھا۔ مگر خوبصورت عورت کو دیکھ کر وہ بس قائل ہو جاتے۔ بِچھ جاتے۔ ریشہ خطمی ہو جاتے۔ اُس وقت اُنہیں ایسی ایسی شگفتہ باتیں سوجھتی تھیں جو سُننے والے مرد اور عورتوں کی محفل میں قہقہوں کی لہریں دوڑا دیتیں۔

پرنس فیروز چند میں ایک خاص وصف تھا کہ وہ جس مزاج یا ذہن کی خوبصورت عورت ہو وہ اپنے آپ کو فوراً اُسی ماحول میں ڈھال لیتے تھے۔ اور اِس طرح کی باتیں یا حرکتیں کرتے کہ وہ عورت اُن کی شخصیت کے مقناطیس

کی طرف خود بخود کھنچی چلی آتی۔ خاص طور پر نوجوان اور
ناتجربے کار حسیناؤں کے لئے تو وہ بے حد خطرناک تھے۔
اوسط عمر کی تجربے کار اور شادی شدہ عورتیں اُن سے
متاثر ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اُن کی شخصیت کے
اثر کو کسی نہ کسی طرح سے اپنے ذہن سے زائل کرنے میں کامیاب
ہوجاتیں۔ لیکن اونچی سوسائٹی میں آنے والی یا آنے کی
خواہش رکھنے والی حسیناؤں کے لئے تو اُن کی شخصیت
ایک طلسمی سحر سے کم حیثیت نہ رکھتی تھی۔
اِس کے باوجود پرنس فیروز چند اپنے حلقے میں اوباش
یا بدمعاش مشہور نہ تھے۔ یہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ
پرنس فیروز کی دلچسپیاں زیادہ تر بے ضرر مزاح
اور خوش سلیقہ چھیڑ چھاڑ تک ہی محدود ہیں۔ جن کے
بغیر کسی کلب کی زندگی مکمّل نہیں ہوسکتی۔ اس لئے وہ ہر
محفل کی جان تھے اور ہر دعوت میں اُنہیں بڑے اصرار
سے اور شوق سے بُلایا جاتا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ پینتالیس برس
کی عمر تک پہنچتے پہنچتے پرنس فیروز نے سات شادیاں
کی تھیں۔ مگر یہ بھی سب جانتے تھے کہ ان شادیوں میں وہ
کس قدر بدقسمت رہے تھے۔ یکے بعد دیگرے یہ تمام
عورتیں دو دو تین تین سال کی مدت میں اُن سے طلاق

لے کر الگ ہو گئیں یا خود بخود اُنہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ بھاگ گئیں۔

پرنس فیروز نے ہر ایک کے ساتھ نبھانے کی پوری پوری کوشش کی۔ مگر جوان اور متلون مزاج حسیناؤں کے دلوں کی نیرنگیاں کون جان سکتا ہے۔ جس حوّا نے آدم کو جنّت سے نکلوا دیا اُس حوّا کی بیٹیوں نے معصوم مزاج لیکن دِل پھینک پرنس فیروز کی ازدواجی زندگی تلخ کر دی تھی۔ مگر شاباش ہے پرنس فیروز کی فراخدلی کو کہ آج تک وہ بندہ اپنی سابق بیویوں کے لئے کبھی کوئی کلمۂ بد اپنی زبان پر نہیں لایا اور اگر اتفاق سے کسی دعوت میں یا کلب میں اُس کی ملاقات اپنی کسی سابق بیوی سے ہو گئی تو وہ اُس سے مؤدّبانہ لہجے میں اُسی طرح ہم کلام ہوا۔ جس طرح کسی دوسرے شریف آدمی کی بیوی سے ہم کلام ہونا چاہیئے۔ دشمن طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے، مگر پرنس فیروز کی روشن ضمیری، صاف کھُلی عادات اور شریفانہ لہجے کے سامنے اُن کی ایک نہ چلتی تھی۔ بلکہ پرنس فیروز کے دم خم، طور و اطوار اور ذاتی وجاہت کو دیکھتے ہوئے اس امر کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ اگر وہ ساٹھ برس کے بھی ہو گئے تو اِسی طرح عورتوں میں مقبول رہینگے۔

پرنس فیروز نے بار سے برف کی ٹکریوں پر برن کا ایک ہلکا سا جام بنوایا اور اُس کی سنہری رنگت کو سراہتے ہوئے گلاس ہاتھ میں اُٹھائے باہر برآمدے میں آ گئے۔ جہاں سبز رنگ کی وِکر چیئر پر بیٹھا ہوا پروفیسر ملکانی اپنی منگیتر کا انتظار کر رہا تھا۔

پروفیسر ملکانی کراچی کے ایک کروڑپتی سندھی سیٹھ کا بیٹا تھا اور اپنے باپ کے ساتھ اس کلب کا ممبر ہوا تھا۔ کلب میں وہی ایک پروفیسر تھا۔ اور بمبئی کے ایک کالج میں تاریخ پڑھاتا تھا۔ شروع میں شوقیہ طور پر پڑھاتا تھا۔ لیکن جب والد نے ساری دولت سٹے میں ہار دی تو روزگار کے لئے پڑھانے لگا۔ کہتے ہیں ہاتھی مرا ہوا بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ مرحوم باپ سٹے میں بہت کچھ گنوا کر اتنی پونجی اپنے بیٹے کے لئے چھوڑ گیا تھا کہ وہ نسبتاً آرام سے رہ سکے۔ اور

بوربن کلب کی ممبری جاری رکھ سکے۔

با ایں ہمہ پروفیسر ملکانی کلب کا غریب ترین ممبر تھا۔ لیکن اُس کی منگنی احمد آباد کی سب سے خوبصورت لڑکی اُرملا شاہ سے ہوئی تھی۔ اُرملا ایک اوسط گھرانے کی سب سے زیادہ ذہین، طبع اور آزاد خیال لڑکی تھی جسے زندگی میں کچھ کرنے، کر کے دکھانے اور آگے بڑھنے اور سوسائٹی میں نام پانے کا شوق تھا۔ اس کی خوبصورتی ماڈرن نہ تھی۔ کلاسیکی خطوط کی حامل تھی۔ جیسے اجنتا کی کوئی راج کماری تصویر سے اُٹھ کر چلی آئی ہو۔ پہلی بار جب وہ پروفیسر ملکانی کے ہمراہ کلب میں آئی تو کلب میں چاروں طرف تہلکہ سا مچ گیا۔ کروڑپتی شراب فروش باٹلی والا کا بیٹا نِکی اور بمبئی کے سب سے بڑے بلڈنگوں کے مالک داروو الا کا بیٹا رِپی اور مشہور مل اونر مگن بھائی شاہ کا بیٹا کِٹی اور ریفریجریٹروں کی سب سے بڑی ایجنسی کے مالک قاضی اُبٹن والا کا بیٹا پُٹو اور باندرہ کے چار سو فلیٹوں کے مالک کا ولی عہد پاکسی رستن سب اُرملا پر فریفتہ ہو گئے۔ مگر اُرملا کو صرف دولت کی چاہ نہ تھی۔ دولت کو وہ ضرور پسند کرتی تھی مگر دولت کے ساتھ ساتھ اُسے آرٹ اور فن اور فلسفہ اور زندگی کا سنجیدہ تجربہ بھی پسند تھا۔ اس

لئے وہ نِکی، سپی، پُٹو اور پاکسی کو پسند نہ کرسکی تھی۔ جن کے پاس دولت تو بے شمار تھی لیکن عِلم کا شعور اِتنا ہی تھا جِتنا خدا نے اُنہیں پیدا کرتے وقت مِکسڈ ڈیپازٹ کی صورت میں اُن کے خالی دماغ میں ڈالا تھا۔ اور گو دھیرج ملکانی کے پاس دولت بہت کم تھی، مگر پھر بھی تھی تو۔ اِس پر وہ دوسری باتیں، اُس کا گمبھیر سُبھاؤ، اُس کی شرمیلی مُسکراہٹ، ادب آرٹ اور تاریخ سے اُس کی دلچسپی، ایسی باتیں تھیں جنہوں نے بالآخر اُرملا کو پروفیسر ملکانی کی منگیتر بنا ڈالا تھا۔

"ہلو پروفیسر؟" پرنس فیروز چند نے برّبن کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے برآمدے کے ایک مرمریں ستون سے لگ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہلو پرنس؟" دھیرج ملکانی نے پورچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اُسے اُرملا کا انتظار تھا اور وہ اِس وقت کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اور پرنس کو معلوم تھا کہ اُسے اُرملا کا انتظار رہے۔ اس لئے وہ اُس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔

"کیا پی رہے ہو؟" پرنس نے پوچھا۔

"بیلی برانڈی"

"اس وقت سہ پہر میں ؟" پرنس نے تحیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

"ہلکا سا نزلہ ہو رہا ہے شاید" ملکانی نے معذرت کے انداز میں کہا۔

"نزلے کی آمد ہے ؟" پرنس نے گہری ہمدردی سے پوچھا اور اُس کی سانس کی آمد و رفت ذرا سی تیز ہو گئی۔ کیونکہ اُس نے اپنے پیچھے ایک گاڑی کے رُکنے کی آواز سُنی اور ملکانی کی نگاہوں کی خوشی سے اندازہ لگا لیا کہ اُرملا گاڑی سے اُتر رہی ہے۔ اِس لئے اُس نے ذرا بلند آواز میں ملکانی سے کہا۔

"تو میں تمہارے لئے ایک ایسی کاک ٹیل بنوا کے لاتا ہوں جو نزلے کے لئے مجرب ہے۔!"

ملکانی کوئی جواب دیئے بغیر اُٹھ کر پورچ کی طرف بھاگا اور پرنس مسکراتا ہوا بار کے اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ملکانی اور اُرملا کو ڈھونڈتا ہوا کلب کے قریبی برآمدے میں پہونچ گیا جس کے سامنے کلب کا جاپانی گارڈن کھُلتا تھا۔ وہاں پُل کے نیچے پانی کے کنارے نیلی اور نارنجی روشنیوں کی دھوپ چھاؤں میں ملکانی اور اُرملا دو پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"نور بن گیلے" جرنل

"محبّت کی لطفیں"۔ پرنس فیروز نے بڑے پیار سے کہا اور ارُملا کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ پھر فیروز نے ایک جام ملکانی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

"لو۔ یہ پی لو۔ اِس سے تمہارا زکام دور ہوجائے گا"

"کیا ہے اس میں؟ ملکانی نے کاک ٹیل کو شبہ کی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی سی سُرخ شراب ہے۔ تھوڑی سی برانڈی ہے۔ تھوڑی سی اورینج کراکاؤ ہے۔ ذرا سی شکر ہے۔ لونگ اور دارچینی ہے اور گرم پانی ہے۔ نزلے کے لئے بہترین نسخہ ہے۔ اٹھارویں صدی سے مجرّب چلا آرہا ہے"۔ پرنس نے تشریح کرتے ہوئے کہا۔

ملکانی نے ذرا چکھ کر کہا۔ ہوں! عمدہ معلوم ہوتا ہے — شکریہ پرنس —!"

ملکانی کو شکریہ ادا کرتے دیکھ کر ارُملا بھی پرنس کی طرف دیکھ کر مُسکرائی۔ پرنس اپنے سینے پر ذرا سا ہات رکھ کر تھوڑا سا جُھکا۔ پھر کہنے لگا۔

"آج آپ نے بہت جھکایا ملکانی کو۔ کب سے بیچارہ برآمدے میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا"

"آج گنپتی پوجن تھا نا! اوپیرا ہاؤس سے چوپاٹی کی جانب ایک بہت بڑا جلوس جارہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک تو ملبار ہل

کا راستہ ہی نہیں کھُلا۔
اِدھر کے لوگ گنپتی کو بہت مانتے ہیں۔ آج جسے دیکھئے لال سونڈ والے گنیش کی مورتی کو سر پر اُٹھائے سمندر کی جانب چلا جا رہا ہے۔"

"گنیش دراصل اِدھر ہی کے لوگوں کا دیوتا ہے۔ ہمارے شمالی ہند میں اس کی پوجا اتنے ٹھاٹ باٹ سے نہیں ہوتی۔" پرنس بولا۔

"جی نہیں!" ملکانی نے تردید کرتے ہوئے کہا۔ "گنپتی یا گنیش جی تو سب ہندوؤں کے دیوتا ہیں۔ شِو کے بیٹے اور پاروتی کے چہیتے ہیں۔ اور سارے جگت کے سدھی داتا ہیں جو کام کسی سے نہ ہو سکے۔ اِن سے کروا لو۔ اسی لئے تو مارواڑیوں سے کولیوں تک سب انہیں پوجتے ہیں۔"

ملکانی کو اپنے علم و فضل کی نمائش کا موقع ملا تھا اور وہ بھی اپنی محبوبہ اُرملا کے سامنے۔ لہٰذا وہ یہ موقع کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔ اور پھر وہ پرنس سے اندر ہی اندر بہت چڑتا اور جلتا تھا۔

پرنس فیروز نے کہا۔ "میرا خیال ہے گنیش کو کسی نے شِو کا اصلی بیٹا نہیں مانا ہے۔ سکند پُران کی روایت یہ ہے کہ ایک روز پاروتی اپنے جسم کی میل اور غلاظت سے کھیل رہی تھی کہ کھیلتے کھیلتے ایک عجیب سی صورت بن گئی۔ وہ اُسے گنگا کے

کنارے لے گئیں وہاں پر اُنھوں نے اُسے ہاتھی کا مُکھ رکھنے والی راکشسنی مالینی کو   کھلا دیا نتیجے میں گنیش پیدا ہوئے پیدا ہونے پر پاروتی نے اُسے مالینی سے لے لیا۔ اس طرح سے گنیش ہندو دیومالا میں آئے۔ شِو کا اصلی بیٹا بن کر نہیں بلکہ متبنّا ہو کر!"

یہ کہانی مجھے سچ معلوم نہیں ہوتی۔ ملکانی نے مزید بحث کرتے ہوئے کہا۔ سکند پُران اور دوسرے پُران گو بہت قدیم ہیں مگر یہ سب جانتے ہیں کہ گپتاؤں کی شہنشاہیت کے زمانے میں اِن میں بہت ردّوبدل کیا گیا ہے۔"

"دراصل گنیش کی تاریخ سکند پُران سے بھی زیادہ قدیم ہے، پروفیسر صاحب" پرنس فیروز نے مُسکراتے ہوئے کہا۔"آپ کو تو معلوم ہوگا کہ گنیش دراصل آریاؤں کے دیوتا نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے اصل باشندوں یعنی دراوڑ کول جنہیں آپ اچھوت، گنوار، راکشس اور شودر کہتے تھے، اُن کی دیومالا سے لئے گئے ہیں!"

"بالکل غلط کہتے ہیں آپ!" ملکانی نے کڑک کر کہا۔"خود رِگ وید میں گنپتی کا ذکر ہے۔"

"مگر یہ ویدوں کا گنپتی ہاتھی کی سونڈ والا گنپتی نہیں ہے۔ گنپتی کا لیڈر یوں سمجھیے کہ جن پتی یعنی جنتا کا لیڈر۔ رہنما۔ اِن معنوں

میں یہ رگ وید میں اندر دیوتا کی تعریف میں آیا ہے۔ رگ وید کے دسویں منڈل میں اور اِس سے بھی پہلے اگر آیا ہے تو رِگ وید کے دوسرے منڈل میں۔ مگر وہاں پر بھی یہ اِسم صِفت کے طور پر استعمال ہوا ہے براہمن اسپتی کی تعریف میں۔ اس کی الگ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ گنیش کی حیثیت میں جو تبدیلی آئی ہے وہ بعد کی بات ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔"

مگر ملکانی کے چہرے کی حیرت اور شرمندگی سے معلوم ہوتا تھا کہ اُسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ بیچارہ ملکانی کالج کے طالب علموں کو پڑھاتا تھا۔ اُس کا مبلغ علم زیادہ تر ولسن یا وِنسنٹ سمتھ کی تاریخ تک حاوی تھا۔ اِس سے زیادہ جاننے کی اُسے کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ مگر آج اُسے احساس ہو رہا تھا کہ اگر وہ زیادہ جانتا تو آج اُرملا کے سامنے اُسے یوں شرمندہ نہ ہونا پڑتا۔ اُرملا اُس وقت بڑی حیرت سے پرنس فیروز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور پرنس اُس کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ کہ اُرملا اُس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے نہایت ہی شیریں لہجے میں پروفیسر ملکانی کو پرنس سمجھاتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں گنپتی شِو کی طرح آریاؤں سے پہلے کا دیوتا ہے۔ موہن جوداڑو کی مہروں میں ہمیں شِو کی مورت ملتی ہے اور اُس وقت ہندوستان میں آریوں کا کہیں وجود نہ تھا۔ پھر یہ

بات بھی دھیان میں رکھئیے کہ منوسمرتی میں. کِن الفاظ میں گنپتی کو یاد کیا گیا ہے۔ یعنی شودروں کا دیوتا، اچھوتوں کا دیوتا جبکہ شمبھو براہمنوں کا اور مادھو کشتریوں کا دیوتا سمجھا گیا ہے۔ ماتوگرھیہ سوتر میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ جس پر گنیش کا سایہ پڑے تو اُس کا کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ ولی عہد پر سایہ پڑے تو اُسے سلطنت نہ ملے۔ دوشیزہ کو بَر نہ ملے، ماں کو بیٹا نہ ملے، مدرس کو شاگرد نہ ملے۔ دھرم سوتر میں گنیش کی تعریف میں صرف ایک لفظ ہے۔ وِگھن یعنی مصیبت اور بلا شبہ جب آریہ لوگ پہلے پہل یہاں آئے ہوں گے۔ تو اُنھوں نے یہاں کے گنپتی یعنی عوام کے رہنما کو ایک کڑی مصیبت ہی پایا ہوگا۔ اس لئے گنپتی یعنی عوام کے رہنما کو اِن بُرے لفظوں میں یاد کیا گیا ہے۔ لیکن بعد میں جب آریاؤں اور یہاں کے اصلی باشندوں کی آمیزش سے ایک نیا کلچر بنا تو اُس میں گنیش کو بھی ناگ دیوتا کی طرح ہندو دیومالا میں ایک مناسب مقام مِل گیا اور گنیش وِگھن کِرت اور وِگھن راج یعنی مصیبت لانے والے کی بجائے سِدھی داتا ہوگئے۔ یعنی ہر طرح کی تکلیف دور کرنے والے غرضیکہ قصّہ یہ ہے ملکانی صاحب کہ ہماری دیومالا بھی ایک طرح کی بورن کلب ہے جس میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔"

یہ کہہ کر پرنس فیروز وہاں سے چلا آیا۔ اُرملا اُنہیں دیکھتی کی

دیکھتی رہ گئی۔ ملکانی جیب سے ایک رومال نکال کر بار بار اپنا چہرہ صاف کرتے رہے۔ حالانکہ چہرے پر کچھ نہیں تھا۔ صرف غصّہ تھا اور غصّہ کسی رومال سے صاف نہیں ہو سکتا۔

پرنس فیروز کے چلے جانے کے بعد اُرملا نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا پرنس فیروز اس قدر پڑھے لکھے آدمی ہونگے۔"

"چین اور فراغت کی زندگی میں انسان بہت کچھ کر سکتا ہے۔ جتنا جی چاہے پڑھ لکھ لے۔ اگر اُنہیں روزی کے لئے تگ و دو کرنا پڑے تو ساری علمیت پسینے کی صورت میں نکل جائے!" ملکانی نے کسی قدر تلخی سے کہا۔

"مگر یہ کرتے کیا ہیں؟" اُرملا نے پوچھا۔

"کسی ریاست کے راج کُمار ہیں۔ عیش کرتے ہیں!" ملکانی نے جل کر جواب دیا۔

بر سر راہے پھر ایک روز ملاقات ہو گئی۔ برا بورن سٹیڈیم میں آسٹریلیا اور انڈیا کا کرکٹ میچ تھا۔ انڈیا کی ٹیم ہار گئی تھی۔ اور اُرملا اور ملکانی کرکٹ کلب آف انڈیا کے برآمدے میں

ایک چوکور مینر کے کنارے بیٹھے ہوئے اور رینج سکوائش سے غم غلط کر رہے تھے کہ پرنس فیروز ایک موٹا سا سگار منہ میں لئے وہاں آن پہنچا۔ اُرملا نے جل کر کہا۔

"ہندوستانیوں کو کھیلنا نہیں آتا۔ آج تک تو کوئی ربر جیت کر نہیں دیا۔"

ملکانی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں ہے۔ ٹیم میں سپرٹ نہیں ہے۔ یکجہتی سے کھیلتے نہیں تو کامیاب کیسے ہوں گے۔"

پرنس نے لقمہ دیا۔ آپ کی بات بڑی وزنی بات ہے۔ لیکن یہ بھی سوچئے کہ کرکٹ ہمارے لئے غیر ملکی کھیل ہے۔ ذرا ان غیر ملکیوں سے کبڈی کھلا کے تو دیکھئے۔ ہمارے کسی بڑے گاؤں کی ٹیم سے ہار جائیں گے۔"

"جانے دیجئے صاحب! کیا بات کرتے ہیں آپ بھی۔ ایک کرکٹ ہی کیا فیصلہ کیجئے۔ ٹینس کو لیجئے۔ آسٹریلیا نے کتنی بار ومبلڈن جیتا ہے۔ ہندوستان نے ایک بار بھی نہیں۔ ٹینس کو چھوڑیئے تیراکی کو لیجئے۔ تیراکی چھوڑیئے تیز دوڑ کو لیجئے۔ آسٹریلوی ہمیشہ آگے رہتے ہیں۔ دراصل قصّہ یہ ہے پرنس فیروز صاحب کہ ہندوستان ایک بوڑھی قوم ہے اور آسٹریلوی ایک نوجوان قوم۔" اتنا کہہ کر ملکانی نے فاتحانہ نگاہوں سے اُرملا کی طرف دیکھا۔

پرنس نے سگار کی راکھ ایک ہلکے سے جھٹکے سے راکھ دان میں گرائی اور آہستہ سے بولے "یہ دلیل بڈھی اور جوان قوم کی مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں۔ اس قسم کا تجزیہ اخباری اور سطحی معلوم ہوتا ہے۔ کہنے کو تو ہندوستانی تہذیب کی عمر چھ سات ہزار برس پرانی ہے۔ مگر یوں سوچئے کہ اس برصغیر میں رہنے والا ہر فرد کم وبیش پچاس ساٹھ برس میں مرجاتا ہے۔ گویا یہ قوم ہر روز مرکر نئی ہوتی ہے۔ نہ صرف یہ قوم بلکہ ہر قوم اپنے نوجوانوں کے ساتھ جوان ہوتی ہے۔ اور اپنے بڈھوں کے ساتھ مرجاتی ہے۔ اور زندگی اور موت کا یہ چکر ہمیشہ چلتا رہتا ہے اس لئے کسی قوم کو بڈھا یا جوان کہنا ان معنوں میں درست نہیں ہے۔

اصل بات یہ ہے پروفیسر صاحب۔ جیسا کہ آپ خود جانتے ہیں آسٹریلیا کے لوگ نچلے طبقے کے انگریزوں کی اولاد ہیں۔ آسٹریلیا غریب اور جرائم پیشہ نچلے طبقے کے فرزندوں سے بسایا گیا ہے۔ کم وبیش یہی صورت حال امریکہ میں پیش آئی۔ وہاں بھی سب سے پہلے وہی لوگ پہنچے جو انگریزی سماج کی نظروں میں راندۂ درگاہ تھے یعنی غریب معمولی عام سطح کے لوگ اور یہ بات تو آپ مانینگے کہ عام لوگوں میں شرفا کے مقابلے میں قوت اور طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ جسمانی کام کرتے ہوئے اُن کے اعضاء اور پٹھے ہم لوگوں سے زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں کھیل کا میدان اور خود

انگلینڈ میں بھی یہ شعبہ زیادہ تر شرفا کے یا کھاتے پیتے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا ہے۔ اس لئے امریکہ اور آسٹریلیا کے لوگ اس میدان میں دوسری قوموں سے آگے رہتے ہیں۔ ہماری سپورٹس کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ شرفا کے ہاتھ میں ہے۔ ذرا اِن کھیلوں کو عام لوگوں تک یعنی متوسط درجے کے لوگوں سے بھی نیچے کے لوگوں تک لے جایئے۔ پھر دیکھئے آپ کی ٹیم کتنی اچھی اور مضبوط ثابت ہوتی ہے۔ اب ایڈن اور ہیرو کا زمانہ گیا صاحب۔ اب تو دھیان چند اور ملکھا سنگھ کا زمانہ ہے۔ میں اگر سپورٹس کا وزیر ہوں تو اپنی کھیل کی ٹیم شہروں کی بجائے گاؤں سے شروع کروں۔"

"آپ بالکل درست کہتے ہیں" ارملا بے اختیار کہہ اٹھی۔

ملکانی کے ہاتھ سے اورینج سکواش کا گلاس میز پر لڑھک گیا۔ پرنس نے فوراً بڑھ کر اپنے رومال سے بہتے ہوئے اورینج سکواش کو ارملا کی طرف جانے سے روک دیا۔ ورنہ بچاری کی قیمتی کنجی ورم کی ساڑھی تباہ ہو جاتی۔ ایک لمحے کے لئے تشکر آمیز انداز میں ارملا کا نازک ہاتھ پرنس کی آستین پر رکا۔ اور اس نے آہستہ سے کہا۔

"تھینک یو"

ملکانی نے جلدی سے کہا "ڈارلنگ جلدی چلیں۔ ورنہ گاڑی نکالنے کیلئے راستہ نہیں ملے گا"

"بائی بائی"۔ پرنس فیروز نے مسکرا کر کہا۔

بمبئی کے بڑے شراب فروش سیٹھ باٹلی والا کے سب سے بڑے لڑکے نِک باٹلی والا نے جسے سب لوگ پیار سے نِکی کہتے تھے۔ اپنے گھر میں اپنی سالگرہ کے موقع پر ایک عالی شان دعوت دی تھی۔ اس موقع پر تاج کے مشہور ٹونی کرِسٹو کا بینڈ موجود تھا۔ نکی نے خاص طور پر اُرملا اور ملکانی کو اس موقع پر مدعو کیا تھا۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ وہ اُرملا پر بُری طرح فریفتہ ہے اور اُرملا بھی اس امر کو جانتی تھی اور وہ دوبار نِکی کو ڈانس کے لئے انکار کر چکی تھی اور صرف ملکانی کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ پہلے ایک فاکس ٹراٹ ناچی۔ پھر ایک والز۔ اس کے بعد جب رمبا کا ایک دور چلا تو ملکانی اور اُرملا دونوں اپنی میز پر بیٹھے رہے اور ڈانس میں شامل نہ ہوئے۔ پرنس فیروز مسکراتے ہوئے اُن کی ٹیبل پر جا پہنچے اور ایک خالی کرُسی لیکر بیٹھ گئے۔

"آپ لوگ رمبا نہیں ناچیں گے ؟" پرنس فیروز نے پوچھا۔

"نہیں"۔ ملکانی نے بڑی سختی سے جواب دیا۔ دراصل مجھے یہ

یورپین ناچ بالکل پسند نہیں۔ فاکس ٹراٹ اور والزتک تو پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن یہ رمبا سامبا چاچاچا۔ سب غلیظ یورپین بدعتیں ہیں۔ ہمیں بالکل پسند نہیں۔" 'ہمیں' میں اس نے اُرملا کو کو بھی شامل کر لیا تھا۔ اور اُرملا چپ ملکانی کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی۔ پرنس فیروز نے رمبا کی دُھن میز پر بجاتے ہوئے کہا۔

رمبا سامبا کونگا مامبو چاچاچا یہ سب یوروپی ناچ نہیں ہیں۔ یہ سب مغربی افریقہ کے رقص کی لے سے مستعار لئے گئے ہیں۔ ان کی روح اتنی ہی غیر یوروپی ہے جتنی بھارت ناٹیم کی یا کتھاکلی کی۔ اسے افریقی کلچر سے سب سے پہلے فرانسیسیوں اور امریکیوں نے اپنے مہذب حبشیوں سے اپنایا اور اب یہ رقص تمام یورپ میں پھیل کر مقبول ہو چکے ہیں۔ مگر اپنی بنیادی صفت میں یہ ہیں افریقی رقص میں اُرملا اگر آپ کو افریقی کلچر سے نفرت نہ ہو تو میرے ساتھ ایک رقص کر کے دیکھئے۔"

پرنس فیروز نے ایسے دلکش انداز میں اپنی درخواست پیش کی اور اس کا ایسا خوبصورت پس منظر باندھا کہ اُرملا انکار نہ کر سکی۔ اور مسکراتا ہوا وجیہہ با وقار پرنس فیروز اُرملا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگا۔ اور ملکانی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔
رمبا ناچتے وقت اُرملا نے ایک رازدارانہ شکایت کے لہجے میں

پرنس سے کہا: "کبھی کبھی ملکانی مجھے بہت بور کرتا ہے۔"
"نہیں نہیں بور تو نہیں کہہ سکتے۔" پرنس نے ملکانی کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ہاں کسی قدر غبی ضرور ہے۔"
پر ناچتے وقت کچھ دیر کے بعد اُرملا اُسی رازدارانہ لہجہ میں بولی: "یہ نکّی اپنی پارٹنر کے ساتھ تین بار ہمارے قریب سے گزر گیا ہے۔ ہر بار مجھے گھور کر دیکھتا ہے۔ اور اس کا گھورنا مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔"
پرنس نے ہنس کر کہا: "یہ نوجوان اپنی خواہشات میں بڑے راست ہوتے ہیں۔ مگر نکّی دل کا بُرا نہیں ہے۔ بیحد عمدہ لڑکا ہے۔ تم نے اس کا سومنگ پُول دیکھا ہے؟"
"نہیں۔"
"آؤ تمہیں دکھائیں۔ میرے خیال میں بمبئی میں اس سے بہتر سومنگ پول کسی کے ہاں نہ ہوگا۔"
ناچتے ناچتے پرنس بڑی صفائی سے اُرملا کو ہال سے باہر لے گیا پرنس کس قدر عمدہ ناچتا ہے۔ اُرملا نے اپنے دل میں سوچا اور اُس کے کندھے سے لگی لگی ہال سے باہر ایک شیریں خواب میں ڈوبی ہوئی چلی گئی۔
واقعی بہت عمدہ سومنگ پول تھا۔ پائین باغ میں زمرّدیں گھاس کے قطعوں کے اندر سنگِ مرمر کے سفید فرش کے بیچ نیلا

پانی نیلم کے جواہر کی طرح چمک رہا تھا کرومیم پلیٹ کی چمکدار سیڑھیاں پانی کے اندر تھرتھرا رہی تھیں۔

"اسے دیکھ کر تیرنے کو جی چاہتا ہے" اُرملا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تیرنا جانتی ہو؟"

"نہیں"

"تو ٹھہرو نکی کو بلاتے ہیں۔ اُس کی بہنوں کے تیراکی کے لباس ہوں گے"

چند منٹوں کے بعد پرنس اُرملا کو تیرنا سکھا رہا تھا۔ اُرملا بار بار اُس کے ہاتھوں میں ایک مچھلی کی طرح پھسل جاتی، مگر غوطہ کھانے سے پہلے ہی پرنس اُسے سنبھال لیتا۔ نکی بھی اب پانی کے اندر آگیا تھا۔ اور اُرملا کے اِدھر اُدھر بڑی مشاقی سے تیر کی طرح گزر جاتا تھا۔ نکی کا تنا ہوا بیحد متناسب جسم پانی میں بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ہولے ہولے اُرملا پانی سے مانوس ہو گئی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد خوشی کی چیخوں میں خودبخود ہاتھ پاؤں چلا کر تیرنے لگی۔ اُس کا سبک اندام سنہرا جسم پانی میں ایک طلائی مچھلی کی طرح ڈول رہا تھا۔

یکایک اُرملا نے ملکانی کو سوئمنگ پُول کے کنارے دیکھا اور مسرت سے چلّا کر کہنے لگی۔

"ملکانی تم بھی ہمارے ساتھ آجاؤ۔

ملکانی نے سر ہلا کر بھاری لہجے میں کہا۔ "مجھے تیرنا نہیں آتا۔"
اُرملا تیرتے ہوئے کروميم پلیٹ کے چمکدار زینے کے قریب چلی گئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے زینے کے جنگلے کو پکڑ کر بولی۔
"پھر تمہیں کیا آتا ہے؟"

افسردہ اور تھکا ماندہ دِن سورج کے ساتھ سمندر میں غرق ہوگیا تھا اور اب سنہری شفق والی شام آگئی تھی اور خوشبوؤں سے لبریز لمحے گرہ در گرہ رات کی زلفیں کھول رہے تھے۔ اور پیاسے ہونٹ مئے ناب کے لرزتے ہوئے سیال کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔
پرنس فیروز کی کوٹھی کے عالی شان کمروں میں ایک بہت بڑی دعوت جاری تھی۔ اور پرنس فیروز چھیلا بنے ہوئے اور اُرملا عروسی لباس میں کسی دور دیس کی پری کا معصوم ملکوتی حسن لئے ہوئے مہمانوں کی مبارکباد وصول کر رہی تھی۔ لطیف چبھتے ہوئے مذاق جن پر وہ خود شرما جاتی، شرم سے لال ہو جاتی اور بار بار اپنے دولہا پرنس کی نگاہوں کا سہارا ڈھونڈتی۔ جب پر کوئی نیا

مذاق ایک نئے پٹاخے کی طرح فضا میں قہقہوں کی طرح گونج اُٹھتا۔ اور پرنس فیروز اپنی نئی دُلہن کو سہارا دیتے ہوئے جامِ صحت پیتے ہوئے آگے چلے جاتے۔ کس قدر خوش تھی۔ کس قدر ہنگامہ تھا۔ اُرملا کی نگاہوں میں کیسی پاکیزہ سی سپردگی تھی۔ گذشتہ تین ماہ میں وہ للکانی کو ایک بھونڈے بدصورت خواب کی طرح بھول چکی تھی۔ اور رِیتی کی محبت میں سرشار اُس سے شادی کر کے اپنے نئے گھر میں آئی تھی۔

رِیکی نے اُرملا کے قریب آ کر کہا۔ "آج تو تمہیں بھی پینا پڑے گی؟"

"نہیں: نہیں!!" اُرملا لرز کر بولی۔

"کوئی حرج نہیں ہے۔" پرنس اپنی دُلہن کو سمجھاتے ہوئے بولے "اونچی سوسائٹی میں تو کوئی رات شراب کے بغیر مکمل نہیں ہوتی رات تو کیا اکثر دن بھی اُس کی مدد کے بغیر نہیں گزرتا۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ تم تو جانتی ہو ڈارلنگ۔"

"نہیں، نہیں!! بالکل نہیں" اُرملا لجا کر بولی "شراب بہت بُری چیز ہے، میں اُسے نہیں چکھونگی۔ فیروز مجھے مجبور نہ کرو۔ یہ ہماری سنسکرتی کے خلاف ہے۔"

پرنس فیروز بڑی محبت سے اُسے سمجھاتے ہوئے بولے "شراب کا تو ہمیشہ سے ہماری سنسکرتی میں دخل رہا ہے۔ اب سوم رس کیا تھا لوگ چاہے اُس کی کتنی ہی تاویلیں کریں۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ سوم رس ایک طرح کی شراب تھی!"

"نہیں یہ غلط ہے۔" ارملا بولی۔

"اچھا جانے دو۔ مگر اتنا تو تم بھی جانتی ہو کہ ہماری پرانی سنسکرتی کے سنہرے زمانے میں یعنی گپتاؤں کے راج میں مدراگھر ہوا کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات ہر رات کو اُن مدراگھروں کے باہر نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی شراب پی کر بیہوش پائی جاتی تھیں۔ کوئی بھی پرانی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لو۔ تمہیں معلوم ہو جائیگا۔"

"تو شراب پی کر بیہوش ہو جانا کوئی اچھی بات ہے نا!"

"میں کب کہتا ہوں اچھی بات ہے۔ مگر ذرا سا چکھ لینا کوئی اتنا بُری بات نہیں ہے۔ اور پھر یہ سب لوگ اتنی عاجزی سے کہہ رہے ہیں۔ اور آخر کون سا تمہیں یہ وہسکی پلا رہے ہیں۔ بس شیری کا ایک جام لے لو!"

"شیری؟"

"ہاں شیری۔ یہ تو دراصل کوئی شراب نہیں ہے۔ بلکہ ایک طرح کا مغربی جل جیرا ہے۔ بھوک بڑھانے کے لئے۔ بس ذرا سی شیری چکھ لو!"

ارملا نے بالآخر شیری کا ایک گھونٹ پی لیا۔ اور چاروں طرف تالیوں اور نعرہ ہائے تحسین کا ایک غلغلہ سا مچ گیا۔

پھر سُوپ سے پہلے ارملا کے پہلی بار ورموتھ چکھی۔

"ارے یہ تو بالکل سیب کا رس ہے۔" پرنس نے اُسے سمجھاتے

ہوئے بجھا اور میں تو تمہیں اطالوی ورموتھ پلا رہا ہوں۔ ورنہ اصلی ورموتھ تو فرانسیسی ہوتی ہے۔ ذرا خشک اور ذرا تلخ اور کچھ اس طرح کی تیز جیسے سودا کی ہجو ہوتی ہے مگر تم تو اناڑی ہو۔ تم فرانسیسی ورموتھ کو ابھی پسند نہ کر سکوگی۔ اس لیئے میٹھے ذائقے والی مارٹینی پیو۔

پھر تلی ہوئی مچھلی کے ساتھ برگنڈی کی سفید شراب شابلی آئی۔ پھر چکن ایلاکیو کے ساتھ بید کے بھُنے ہوئے میں کیانتی کی یاقوت رنگ شراب آئی۔ پھر ہر کورس کے ساتھ کوئی نہ کوئی شراب آتی رہی۔ جرمن کی رائن ہاسن۔ ہنگری کی توکئی اور بوردو کی سینٹ ایملائن۔ آخری کورس کے بعد کونیاک اور کونیاک کے بعد کریم دی منتھ۔ ہرے رنگ کی پودینے کے ذائقے والی زبان کو پکڑ کر چوستی ہوئی سبز پری۔

اُرملا ایک عجیب گنگُنے نشے میں سرشار پرنس فیروزا اور نکی اور چند دوسرے معزز مہمانوں کے ساتھ باہر ٹیرس پر آ گئی تھی۔ ایک طرف دیوار پر میگنولیا کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف بڑے بڑے گملوں میں پام کے مورپنکھ اپنے چھتنار سے پھیلائے نیم تاریکی میں مدھوش تھے۔ دور نیچے سامنے سمندر ایک لڑکھڑاتے ہوئے شرابی کی طرح ڈانواں ڈول ہو رہا تھا اندر کسی کمرے میں کوئی پیانو بجا رہا تھا خوشبوؤں کے مرغولوں میں لرزتی ہوئی خوش جمال عورتیں اُرملا کا ہاتھ چھُو کر یا اُسکے گال یا ماتھا چوم کر واپس جا رہی تھیں۔ مرد اپنے کالے جوتوں کی ایڑیوں کو ملا کر اُرملا کے سامنے جھُکتے ہوئے آخری بار مبارکباد دیکر رخصت ہو رہے تھے۔ اُرملا تھک کر کُرسی پر لیٹ گئی تھی۔ سب کچھ

دھندلا دھندلا سا تھا۔ سمندر، پام مہمانوں کے چہرے، باگن ویلیا کے پھول اُسکی زلفوں کی خوشبو، آوازیں، لہریں، لرزشیں سب چیزیں ایک خوبصورت بھنور میں تھیں۔ اور وہ ہولے ہولے اسُ میں چکر کھاتی جا رہی تھی۔

پھر سب لوگ چلے گئے۔ صرف نکی اور پرنس اور اُرملا باقی رہ گئے۔ اُرملا کی آنکھیں ڈوبنے لگیں اور اُسکی پلکیں اُسکے رخساروں پر بار بار گرنے لگیں۔ اور اُسے گہری نیند آنے لگی اور اسُ کا جی چاہا کہ یہ کمبخت نکی یہاں سے فوراً چلا جائے اور پرنس اُسے اپنی باہوں میں اُٹھا کر اندر لے جائے۔

"اُف میں چل نہیں سکتی" اُرملا نے تھکے تھکے لہجے میں کہا "اور اب مجھے سخت نیند آ رہی ہے۔ ڈارلنگ مجھے اُٹھا کر اندر لے چلو"

پرنس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر اُرملا کو ایسی نیند آ رہی تھی کہ اُسکی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور چند لمحوں کے بعد اسُ نے محسوس کیا جیسے پرنس نے اُسے اپنی باہوں میں اُٹھا لیا ہے۔ وہ ایک مسرت آمیز آہ کے ساتھ اسُ پر جھک گئی اور اپنی گردن اسُ کے شانے پر رکھ کر بولی "ڈارلنگ"

"سویٹ ہارٹ؟" اسُ کے کانوں میں آواز آئی۔ لیکن یہ آواز پرنس کی آواز سے اس قدر مختلف تھی کہ ایک دم اُرملا چونک گئی۔ اور اسُ نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ نکی اُسے اپنی باہوں میں اُٹھائے اندر لئے جا رہا ہے۔ اُرملا زور سے چیخی۔!

"فوراً مجھے نیچے اُتارو۔ بدمعاش نکی۔ جانتے نہیں ہو تم میرے

شوہر نہیں ہو۔"

"فی الحال یہی تمہارا شوہر ہے!"

پرنس فیروز کی آواز آئی۔ وہ باہر ٹیرس کی ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ اُسکی گردن اُسکے سینے پر جھکی پڑی تھی۔

ارملا لڑکھڑاتی ہوئی بھاگی اور پرنس فیروز کی آرام کرسی کے پاس جاکر اُسے زور سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

"پاگل تو نہیں ہوگئے ہو کیا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ تم ہوش میں ہو کیا؟"

پرنس فیروز نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سر سے پاؤں تک ارملا کو دیکھا۔ پھر کسی قدر آزردہ لہجہ میں بولا۔ "تم نے ملکانی کو چھوڑ دیا کیونکہ اُسکے پاس صداقت تھی۔ جھوٹ بے عمل فضیلت کا ملمع نہ تھا۔ اُسکے پاس رولز رائس نہ تھی۔ معمولی ہمبر تھی۔ اُسکے پاس اتنی دولت نہ تھی جتنی میرے پاس ہے۔ تم نے اپنے دل کو سمجھایا اور اس سے ایک سودا کیا۔ میں بھی تم سے سودا کرتا ہوں۔ بیوی تم میری رہوگی۔ جاؤگی دوسروں کے پاس۔ میں تمہیں عزت دوں گا۔ اپنا نام دوں گا۔ شادی شدہ زندگی کا تحفظ اور اُسکا وقار دوں گا اور تم میری کوٹھی کا کرایہ چکاؤگی۔ میری رولز رائس میں پٹرول ڈالوگی۔ اور میری کلب کے بل ادا کروگی۔ بالکل نقد۔ یہ سودا ہے ڈارلنگ!"

"تم راجکمار ہوکر دلال ہو؟" ارملا حیرت اور نفرت سے چیخی۔

"میں تمہاری طرح حالات کا قیدی ہوں"۔ پرنس کی آواز سرگوشی سے بھی نیچے تھی۔ "مجھے کچھ نہیں چاہئے اب۔ ایک جام شراب کا۔ ایک کمرہ کلب کا۔ ایک رات کسی بھی عورت کے پاس۔ مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیئے۔ جاؤ

نیچی لے جاؤ اِسے۔ تم دونوں میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔"
ارملا فرش پر دو زانو ہو کر رونے لگی۔
"مجھے اِن آنسوؤں سے سخت نفرت ہے۔" پرنس فیروز چند آرام کرسی سے اُٹھ کر بولا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔" یہ کہکر وہ وہاں سے چلا گیا اور نیچی اور ارملا کو اکیلا چھوڑ گیا۔

دو سال بعد ارملا نے پرنس فیروز سے طلاق لیکر ملکانی سے شادی کر لی۔
جب نیلوفر نے یہ سُنا تو اُسے سخت حیرت ہوئی۔ کوئی عورت پرنس فیروز چند کو کیسے طلاق دے سکتی ہے؟ نیلوفر گزشتہ سال کی مس سوری تھی اور اِس سال بمبئی کے مقابلہ حسن میں شرکت کرنے کیلئے آئی تھی۔ اولڈ بوربن کلب میں اُسکی ملاقات پرنس فیروز چند سے ہوئی تھی۔
"یہی تو میری بدقسمتی ہے!" پرنس فیروز چند نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "کوئی عورت مجھے آج تک نہیں سمجھ سکی۔"
نیلوفر نے گہری ہمدردی کی نگاہوں سے پرنس کی طرف دیکھا اور پرنس نے اُس کی گہری ہمدردی کی نگاہوں کی شہہ پاکر ایک لمحے کیلئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا۔
جانے یہ عورت کتنے سال تک میرے ساتھ چل سکیگی۔ آہ! یہ زندگی کس قدر مشکل ہے!

بیوی کُترا

اولڈ بورین کلب تو ملبار ہل پر واقع ہے۔لیکن اولڈ یاٹ کلب سمندر کے کنارے کف پریڈ پر واقع ہے دونوں کلبوں میں ایک عجیب قسم کی ساجھے داری ہے۔جس میں اولڈ یاٹ کلب کی حیثیت ایک جونیر پارٹنر کی ہے۔ وہ اس طرح کہ اولڈ بورین کلب کے تمام ممبر اولڈ یاٹ کلب کے ممبر متصور ہوتے ہیں۔لیکن اولڈ یاٹ کلب کا ہر ممبر اولڈ بورین کلب کا ممبر نہیں ہو سکتا۔اولڈ یاٹ کلب کی شرائط زیادہ آسان اور لچکدار ہیں۔ وہاں صرف روپیہ دیکھا جاتا ہے۔خاندانی شرافت اور اس قسم کے جھمیلوں میں نہیں پڑتے وہ لوگ!

کنور بلدیو سنگھ دونوں کلبوں کے ممبر ہیں۔مگر وہ اپنا زیادہ وقت اولڈ یاٹ میں گزارتے ہیں۔کیونکہ اُنہیں بادبانی کشتیوں کی ریس کا بہت شوق ہے۔اسے یہ لوگ یاٹنگ یا سیلنگ کہتے ہیں۔کنور بلدیو سنگھ جب سے رنڈوے ہوئے ہیں اُنکے شوق بہت حد تک محدود ہو چکے ہیں۔اب اُنکی دلچسپیاں صرف شراب، عورت اور بادبانی کشتیوں پر ختم ہو جاتی ہیں۔اس سے پہلے اُنہیں کرکٹ، شکار اور سنوکر کا بھی چسکا تھا۔لیکن جب سے اُن کی بیوی

رہی ہے۔ انھوں نے مرحومہ کی یاد میں کرکٹ شکار اور نوکر تینوں مشغلے
ترک کر دیئے ہیں اور اب صرف شراب عورت اور بادبانی کشتی پر قناعت
کرتے ہیں۔ اُنکی بادبانی کشتی کا نام اُن کی مرحومہ بیوی کنور رانی پربیلا سنگھ
کے نام پر پربیلا رکھا گیا ہے۔ شرابوں میں وہ صرف بلیک ڈاگ چکھتے ہیں
اور عورتوں میں صرف دوسرے کی بیوی پسند فرماتے ہیں۔ کنور بلدیو سنگھ
کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کلب کی پچیس سالہ ممبری میں آج
تک کسی کنواری لڑکی پر بُری نظر نہیں ڈالی۔ ایسے وضعدار فرشتہ سیرت،
پُرانی قدروں پر جان چھڑکنے والے لوگ آج کل کہاں ملتے ہیں۔؟
جس طرح کچھ لوگ ہمارے سماج میں دوسرے کی جیب کترنے میں
مہارت رکھتے ہیں۔ اور اپنے پیشے کی مناسبت سے جیب کترا کہلاتے
ہیں۔ اسی طرح کنور بلدیو سنگھ کو دوسرے کی بیوی کترنے میں ملکہ حاصل
ہے۔ اور وہ یار لوگوں میں بیوی کترا کے نام سے مشہور ہیں۔ گویا اُن
کا پیشہ نہیں ہے محض ایک شغل ہے۔ جسے وہ کبھی کبھی محض اپنے شوق کی
خاطر اور کبھی کبھی اپنے دوستوں اور مصاحبوں کی دلبستگی کے لئے اختیار
فرماتے ہیں۔ موخر الذکر سلسلہ اُس وقت شروع ہوتا ہے جب کلب میں
کوئی نئی چاندسی صورت دکھائی دے اور یار لوگ اُسے پھلانسنے کے لئے
اپنی سی کر کے ہار جائیں۔ اُس وقت تک کنور بلدیو سنگھ کسی کے معاملے
میں دخل نہیں دیتے۔ کبھی کسی معاشقے میں پہل نہیں کرتے بلکہ انتہائی
فراخدلی اور سیر چشمی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے احباب کو اس امر کا
موقع دیتے ہیں کہ وہ جی بھر کے لذتِ کام و دہن کی آزمائش کر لیں۔
اُنہیں معلوم ہے کہ معاملہ اگر سنگین ہوا اور عورت کسی طرح پھسلنے پر آمادہ

نہ ہوئی۔ تو احباب کو ہار مان کر کنور بلدیو سنگھ کے ہی سپرد یہ معاملہ کرنا پڑے گا۔ جسے وہ چند روز ہی میں بلکہ اکثر ایک روز ہی میں بڑی خوش اسلوبی سے سُلجھا لیں گے۔ یہ بات خود انہیں معلوم ہے۔ اُن کے احباب کو بھی معلوم ہے۔ اور کلب کی اکثر عورتوں کو بھی معلوم ہے۔

یہ سوچنا غلط ہوگا کہ کلب میں صرف اوباش عورتیں ہی آتی ہیں کلب میں کئی طرح کی عورتیں آتی ہیں۔ ایسی عورتیں جو واقعی کنواریاں ہوتی ہیں۔ اور جن کے اردگرد ہمیشہ اُن کے خاندان کی کوئی نہ کوئی شریف عورت منڈلاتی رہتی ہے۔ ایسی عورتوں کو کلب کی اصطلاح میں کچی کلیاں کہا جاتا ہے اور انہیں شجرِ ممنوعہ کی طرح بخش دیا جاتا ہے، کہ ایسے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ پھر کچھ عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو پیشہ ور کنواریاں ہوتی ہیں اور تیس چالیس برس کی عمر تک دو درجن معاشقوں کے بعد بھی کنواریاں کہلاتی ہیں۔ اکثر کلبوں کی رونق انہی عورتوں کے وجود سے ہوتی ہے۔ پھر بہت سی عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو واقعی شریف شادی شدہ، وفاشعار اور شوہر پرست ہوتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو بہن جی بھابی جی، موسی جی اور چچی جان کہہ کر برداشت کر لیا جاتا ہے۔ پھر کچھ ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو "نئے چہرے" کہلاتی ہیں۔ کلب کے بیشتر ممبروں کی توجہ اُن کی طرف مبذول رہتی ہے۔ جونہی کوئی نیا چہرہ آیا اور یاروں نے پانسہ پھینکا۔ کبھی کبھی ایک ہی مچھلی پر دو چار ماہی گیر اکٹھے ٹوٹ پڑتے ہیں۔ شکاری عمدہ سے عمدہ جال لیکر آتے ہیں۔ نئے سے نیا لاشہ لگایا جاتا ہے۔ اگر چڑیا پھنس گئی تو سبحان تیری قدرت ورنہ نون تیل ادرک! پھر اس نئے چہرے کو یار لوگ یوں ترک کر دیتے جیسے شکاری

گندی مچھلی کو چھو کر واپس پانی میں پھینکدیتے ہیں۔ اور اپنے پرانے جانے پہچانے چہروں پر اکتفا کرتے ہیں۔
کلب میں گذشتہ پندرہ دن سے ایک نئے چہرے کے چرچے تھے۔ مسز بیلا رائے چودھری اپنے خاوند شری پرو فل رائے چودھری کے ہمراہ لندن جانے والی تھیں۔ جہاز میں سیٹیں بُک ہو چکی تھیں۔ جب کمپنی کے اصلی ہیڈ کوارٹر سے مسٹر چودھری کو یکایک پندرہ دن کے لئے بلوا لیا گیا۔ پرو فل اپنی حسین بیوی کو فلیگ ہوٹل میں چھوڑ کر دہلی چلا گیا۔ سکیم یہ تھی کہ پندرہ دن کے لئے واپس دہلی جانا مسز چودھری کے لئے بیکار تھا۔ جبکہ پندرہ دن کے بعد ہی فوراً اُن دونوں کو پھر بمبئی سے لندن کے لئے روانہ ہونا پڑے گا۔ لہٰذا پرو فل بیلا کو فلیگ ہوٹل میں چھوڑ کر اُسے اپنے دوست اور لکھ پتی بزنس مین کھیم جی کلیان جی کی نگرانی میں چھوڑ کر بمبئی سے دہلی چلا گیا۔
کھیم جی کلیان جی سکریپ آئرن یعنی ٹوٹے پھوٹے لوہے کا بیوپار کرتے ہیں۔ اور کاٹن گرین کے علاقہ میں اُن کے کئی گوڈاؤن تھے۔ اس کے علاوہ ان کا دل اور چہرہ بھی زنگ آلود لوہے کی طرح سخت اور بے رس تھا۔ پھر انھیں بیس سال سے دمہ، ذیابطیس اور گنٹھیا کے مرض تھے اور یہ تینوں مرض اس قدر توجہ طلب کرتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں کسی دوسرے مرض کو پالنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ کلب کے کچھ ممبروں کے خیال میں عورت بھی ایک مرض ہے جو صرف مردوں کو ہوتا ہے۔
اس لئے کھیم جی کلیان جی نے کچھ رفع شر کی خاطر، کچھ اپنے دوست چودھری کی خوشنودی کی خاطر کچھ کلب کے ممبروں کے کلیان کی خاطر مسز

بیلا رائے چودھری کو کلب میں آزاد چھوڑ دیا۔ جہاں مسز چودھری اپنی دلربا اداؤں کی وجہ سے بہت جلد کلب کے شوقین مزاج ممبروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔

بیلا ایک سرو قد، گیسو بریدہ، موہنی مسکراہٹ والی بنگالی حسینہ تھی۔ بنگال کا جادو یوں بھی مشہور ہے۔ بیلا کی آواز اتنی میٹھی تھی کہ اس کے گلے پر شہد کے چھتے کا گمان ہوتا تھا۔ جب وہ چلتی تھی تو دیکھنے والوں کے دل لوٹتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی عورت نہیں چل رہی ہے۔ راج ہنسنی اپنی لانبی گردن نیوڑھائے کسی جھیل کی سطح پر تیر رہی ہے۔ جب وہ گاتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا گلے سے آواز نہیں، پگھلی ہوئی چاندنی بہہ رہی ہے۔ جب وہ اپنا نچلا ہونٹ ذرا سا دبا کر مسکراتی تھی تو دیکھنے والوں کے دل میں گلاب کے پھول کھل جاتے تھے۔ اور بنگالی آنکھوں کی سیاہ مسحور کن اداسی تو مشہور ہے۔ پہلے دن ہی گھائل ہونے والے اسکے نام پر آہیں بھرنے لگے۔

بیلا رائے کو کلب کا ماحول بہت پسند آیا۔ بیشتر مردوں کی توجہ پر وہ برا ماننے کے بجائے دل ہی دل میں کھل اٹھی۔ اسکی وجہ تھی۔ پروفل رائے چودھری ایک انگریزی صابن بنانے والی کمپنی میں سیلز منیجر تھا۔ اس بیچارے کو اپنے کام کے سلسلے میں اکثر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں بیلا اپنی تنہائی اور اسکے سونے پن کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔ پھر جب کبھی پروفل اپنے دورے سے واپس آتا تو زیادہ تر صابن کے بارے میں ہی باتیں کرتا۔ کیونکہ اس کا پیشہ ہی صابن

بیچتا تھا۔ اُس کا اگر بس چلتا تو نہ صرف دِن بھر صابن کے بارے میں باتیں کرتا بلکہ لوگوں کو صابن کھِلا دیتا۔ اور بیلا ایک خوش مذاق پڑھی لکھی ادب، شاعری اور رقص کی دلدادہ عورت تھی۔ اور پرونل کو کلب لائف سے نفرت تھی۔ وہ اپنی بیوی سے شدید محبت کرتا اور ایک شدید محبت کرنیوالے شوہر کی طرح اپنی بیوی کے حسن و جمال کا حاسد بھی تھا۔ اور جہاں تک ہو سکتا تھا اپنی بیوی کو دوسروں کی دسترس سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ اِس لئے بیلا اپنی شادی شدہ زندگی سے مطمئن نہ تھی مگر چونکہ وہ ایک وفا شعار سیدھی سادی عورت تھی۔ اس لئے اپنے دِل کے جذبات کو دبا کر جس طرح بھی ہو سکا اب تک اپنی روکھی سیٹھی زندگی پر قناعت کرتی رہی۔ اُس کا دل ایک شوخ و شنگ تتلی کی طرح گھومنے کو بہت چاہتا تھا۔ کاش اُس کا خاوند بھی چھیلا بانکا ہنگامی زندگی بسر کرنیوالا ہوتا۔ مگر وہ تو دن رات صابن کے سوا اور کوئی بات نہ کرتا تھا۔ صابن کی تعریف سُن سُن کر بیلا کے دل میں دنیا بھر کے تمام صابنوں سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ لنڈن جانے کی بھی اُسے خواہش نہ تھی۔ کیونکہ اسے بخوبی معلوم تھا کہ لنڈن میں اُس کا خاوند دِن رات صابن کی فیکٹری میں گھسا رہے گا۔ جہاں وہ مزید ٹریننگ کے لئے کمپنی کی طرف سے بھیجا جا رہا تھا۔ اور وہ دن بھر ایک ٹھنڈے برفیلے فلیٹ میں ایک اجنبی ماحول میں سڑا کریگی!

مگر اس کلب کا ماحول کس قدر روشن اور کھُلا ہوا تھا۔ مردوں کے تعریفی فقرے کتنے خوبصورت تھے۔ اُن جملوں سے گویا گلاب اور جوہی کی مہک آتی تھی۔ مارٹینی کی پہلی کاک ٹیل میں کیسی تازگی تھی جیسے برسات

کی پہلی پھوار ہوتی ہے۔ والز کے پہلے رقص میں کتنا ٹُبک پن تھک جیسے ہواؤں میں اُڑنے والی کوئی تتلی ہو۔ ایسی ہی زندگی تو وہ چاہتی تھی۔ اور جلنے کیونکہ وہ اب تک قیدِ تنہائی کاٹتی چلی آئی تھی۔ اپنی بے مزہ جوانی کے لٹتے ہوئے ایام کو یاد کرکے اُسکے دل میں اپنے شوہر کے لئے نفرت کا جذبہ اُبھرنے لگا۔

مگر آج تک اُس نے کوئی ٹھوکر نہیں کھائی تھی۔ اس لئے آخری قدم اُٹھانے سے پہلے ہمیشہ گھبرا جاتی۔ پہلے پیگ کے بعد دوسرا پیگ لینے سے انکار کر دیتی۔ کسی مرد کی بیحد بیباکی سے ڈر کر کترا جاتی۔ اور وہاں سے اُٹھ جاتی۔ رقص کرنیکے بعد جب کسی کے ساتھ اکیلے ڈرائیو پر جانے کا سوال پیدا ہوتا تو جھجک کر یا پریشان ہو کر ٹال دیتی۔ وہ آگ تاپنا چاہتی تھی۔ مگر آگ کی حدّت سے ڈرتی تھی۔ اس لئے چار پانچ دنوں کی کاوشوں کے بعد بہت سے مردوں نے اپنی ہار مان لی۔ کلب کے اراکین اپنے بزنس کی طرح محبّت میں بھی فوری منافع کی توقع کرتے ہیں۔ یہ لوگ انتہائی مصروف ہوتے ہیں۔ اِن کے پاس اتنا وقت کہاں ہوتا ہے کہ پوری زندگی ایک عورت کے عشق میں صرف کر دیں۔ کلب کی تن آسان زندگی میں اگر ایک عورت دو چار روز میں ہاتھ نہیں آتی تو پھر اُس کا پیچھا کرنا بیکار ہے۔ لہٰذا یاروں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور معاملے کو کنور بلدیو سنگھ کے سپرد کر دیا۔ اور پھر دور ہی دور سے اپنی وہسکی کا جام اُٹھائے پرُانے کھلاڑی کے کھیل کو دیکھنے لگے!

جب احباب نے کنور صاحب سے شکایت کی کہ "ہم سے نہیں ہوتا اُستاد، بڑی حرّافہ ہے! پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی۔ یوں کیسی شگفتہ

باتیں کرتی ہے۔ مگر عین وقت پر کترا جاتی ہے۔ بڑی چار سو بیس ہے۔"
اس قسم کی شکایتیں سُن کر کنور بلدیو سنگھ مُسکرائے۔ وہ ایک عرصہ سے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ سب سے آخر میں چال چلنے میں یہ خوبی بھی تھی کہ کنور بلدیو سنگھ دوسروں کے آزمائے ہوئے تمام وار دیکھ لیتے تھے۔ اس عرصے میں شکار کی خصوصیت اور اسکی تمام خامیوں اور کمزور پہلوؤں سے نفسیاتی طور پر آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کی شخصیت کے حسن و قبح پر غور کرنے کا وقت بھی انہیں مل جاتا تھا۔

پورا قصّہ سننے کے بعد کنور بلدیو سنگھ بولے "یارو اب تم ہٹ جاؤ اور اپنا کھیل بھی دیکھو!"

"ہُرّے" بہت سے دوست ایک دم چلا کر بولے۔ پھر سب لوگوں نے Best of luck کہہ کر اپنی وہسکی کے جام خالی کر دیئے۔

دوسرے دن یاروں نے دیکھا کہ مشرقی لاؤنج کے ایک کونے میں بیلا اور کنور جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور بیلا انہیں گیتانجلی پڑھ کر سُنا رہی ہے۔ شعروں کا مطلب سمجھا رہی ہے۔ کنور بلدیو سنگھ آج صبح کہیں سے گیتانجلی کا ایک نسخہ اُٹھا لائے تھے۔ اُنھوں نے اپنے عشق کی شروعات نہایت عمدہ طریقے سے کی تھی۔ یعنی رابندر ناتھ ٹیگور سے۔ ایک بنگالی کے دِل کو گرفت میں لانے کے لئے پہلا قدم یہی ہے۔
"گرو دیو! گرو دیو!!" کنور صاحب نے شردھا بھری آواز میں کہا۔

"گرو دیو کی کوِتا پر تو میری جان جاتی ہے۔ بیلا جی۔ اُن کی شاعری کیسی سبک اور نازک اندام ہے۔ جیسے میری بادبانی کشتی سمندر پر تیرتی ہے ایسے ہی گرو دیو اپنی شاعری کی کشتی پر بیٹھ کر انسانی جذبات کی لہروں پر مچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گرو دیو اِس دنیا کے سب سے بڑے شاعر ہیں" بیلا بیحد خوش ہوئی۔ مگر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولی "نہیں اب ایسا بھی نہیں ہے۔ دنیا میں اور بھی بڑے شاعر گذرے ہیں "

"جی نہیں " کنور بلدیو سنگھ نے کامل قطعیت سے کہا "گرو دیو کا جواب نہیں ہے اس دنیا میں۔ افسوس یہی ہے کہ میں نے گورو دیو کو صرف انگریزی میں پڑھا ہے۔ سُنا ہے بنگلہ میں اِن کوِتاؤں کا مزا ہی کچھ اور ہے!"

بیلا بیحد خوش ہو کر بولی "سُنیئے یہی کوِتا میں آپ کو بنگلہ میں سُناتی ہوں"

"جی نہیں! ایسے کام نہیں چلے گا۔ گا کر سُنایئے۔!"

پہلے تو بیلا نے انکار کیا۔ پھر کچھ اصرار کے بعد ـــ لوگوں نے دیکھا کہ لاؤنج کے کونے میں بیٹھی ہوئی بیلا گا رہی ہے اور کنور بلدیو سنگھ آنکھیں بند کئے جھوم رہے ہیں۔

جب گیت ختم ہو گیا۔ تو کافی دیر کے بعد کنور بلدیو سنگھ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولے "گورو دیو کا نغمہ اور آپ کی آواز؟ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں شانتی نکیتن پہونچ گیا۔ جیسے میں روی ٹھاکر کے چرنوں میں ہوں۔ وہ خاموش متین سنجیدہ چہرہ، وہ کھُلا آسمان، وہ ناریل کے سُندر جھُنڈ۔ اس پر یہ زبان! صاحب میری تو یُوپی والوں سے لڑائی ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی زبان کی بیحد تعریف کرتے ہیں۔ مگر نہیں صاحب ـ بنگلہ کے شائستہ اور میٹھے لہجے کو کون پہنچ سکتا ہے۔ جس میں آپ کی آواز شہد

گھول دیتی ہے۔

بیلا کا چہرہ مسرت سے کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ وہ کچھ بول نہیں سکی۔ کنور بلدیو سنگھ نے ایک گہرے اعتماد اور انجانے انداز میں بیلا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولے: "کیا آپ مجھے بنگلہ سکھا دینگی۔؟"

"میں تو یہاں کتنے روز ہوں؟ بس آٹھ دس روز سے زیادہ تو نہیں رہوں گی!"

"بہت وقت ہے۔ آدمی کے دل میں اگر سیکھنے کی تمنا ہو۔ اور آپ ایسی عورت سکھانے کو ملے تو سیکھنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ میری مرحوم بیوی پرمیلا کو بنگالی زبان سے عشق تھا۔"

"آپ کی۔؟ آپ کی بیوی مر چکی ہیں؟" بیلا نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ آٹھ سال ہو گئے!"

"اور آٹھ سال تک۔ میرا مطلب ہے اب تک آپ نے دوبارہ شادی نہیں کی۔؟"

"کوئی اپنے مطلب کی عورت نہیں ملی" کنور جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ اور پھر اپنی آنکھیں نیچے جھکا دیں۔

نجانے کیوں بیلا اکدم آبدیدہ ہو گئی۔ کنور جی کا ہاتھ ابھی تک اُسکے ہاتھ پر تھا۔ مگر اپنا ہاتھ ہٹانے کو بیلا کا جی نہ چاہا۔ "بیچارہ!" بیلا نے اپنے دل میں کہا: "اوپر سے کسقدر کھلنڈرا لگتا تھا۔ ہر وقت سیلنگ کرتا ہوا یا شراب پیتا ہوا۔ مگر اندر سے یہ کتنا معصوم اور مظلوم ہے۔"

اسکے بعد دو دن یاروں نے دیکھا کہ کنور بلدیو سنگھ انتہائی سعادتمندی سے شاگرد بنے ہوئے بیلا سے کلب میں بنگلہ زبان سیکھ رہے ہیں۔ دونوں صبح

صبح ہی کلب میں آجاتے تھے۔ ایک ہوٹل سے دوسرا اپنے گھر سے اور شام کو ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے۔ کنور رلبدیو سنگھ نے کبھی بیلا کو اکیلے سیر پر جانے یا ڈرائیو کرنے کی دعوت نہیں دی۔ کبھی کوئی فحش مذاق نہیں کیا۔ ایک رقص کے بعد کبھی دوسرے رقص کی فرمائش اس سے نہیں کی۔ انتہائی سلیقہ مندی سے چل رہے تھے۔

"بہت سلو جا رہا ہے میرا یار!" پرنس فیروز نے جو خود اس لائن میں ایک اُستاد کا درجہ رکھتے تھے رِسپی نام کے ایک لکھ پتی نوجوان سے کہا۔

"کنور کی اپنی ٹکنیک ہے پرنس!" رِسپی اپنی سنہری پیٹی کستے ہوئے بولا "اور اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا ہے۔ اور ابھی تو اس نے اپنا ہنٹنگ کوٹ نہیں نکالا ہے۔"

کلب میں کنور رلبدیو سنگھ کا شکاری کوٹ بہت مشہور تھا۔ یہ آدھا سکاٹ لینڈ کی اُون کا اور آدھا چمڑے کا بنا ہوا تھا۔ اور اس کی باہر کی دونوں جیبیں تھیلوں کی طرح باہر لٹکی رہتی تھیں۔ اور کہنیوں اور آستینوں پر بھی بھورا چمڑا لگا ہوا تھا۔ یہ کوٹ صرف دو وقت نکالا جاتا تھا۔ ایک تو بادبانی کشتیوں کی بڑی ریس کے موقعے پر دوسرے اُس وقت جب کنور جی کسی عورت پر اپنا آخری داؤ آزمانے کے لئے تیار ہو جاتے یہ ہنٹنگ کوٹ گویا ایک طرح کا سگنل تھا۔ علم تھا لڑائی کے آخری دور کا۔ جس دن یہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر کنور رلبدیو سنگھ کلب میں آتے تھے۔ اُس دن یار لوگ سمجھ جاتے تھے کہ آج حریف کی خیر نہیں۔ چاہے وہ کوئی عورت ہو یا ریس میں کوئی اُن کا مخالف ہو!۔

چنانچہ پرنس فیروز اور رِسپی کی اس گفتگو کے دوسرے دن ہی جب کنور صاحب

اپنا ہنٹنگ کوٹ پہن کر کلب داخل ہوئے تو دبی زبان میں چاروں طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔

آج اعلان جنگ ہے!

فائنل ہے میچ کا!

بے چاری۔

رضیہ عطاءاللہ جو اس کلب میں نئی نئی آئی تھیں اور جس نے لکھنؤ میں اپنے حسن و جمال کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ تنک کر اپنی سہیلی مسز رضا علی سے پوچھا "یہ کون آدمی ہے؟ اس نے کیسا جنگلیوں کا سا لباس پہن رکھا ہے۔؟"

"یہ کنور بلدیو سنگھ ہے۔ بڑا چھیلا سمجھا جاتا ہے۔"

"ہٹو!" رضیہ عطاء اللہ انتہائی بیزار ہو کر بولی۔ "بالکل بن مانس معلوم ہوتا ہے۔"

ٹیکا پرمل کمار نے اپنے دوست گردھاری لال سے سرگوشی میں کہا۔ "لالہ گردھاری لال اس کمبخت کے ہنٹنگ کوٹ میں کیا رکھا ہے؟ جس دن کنور یہ کوٹ پہنتا ہے۔ عورت کی ساری مخالفت ختم کر دیتا ہے۔

یہ سب باتیں یاٹ کلب کے برآمدے میں ہو رہی تھیں جس کے زینے کف پریڈ سے سمندر تک جاتے تھے۔ جہاں پانٹون برج سے لگے ہوئے کلب کے یاٹ کھڑے تھے۔ آج سیلنگ کرنے کیلئے کنور یہ کوٹ پہن کر آیا تھا۔ اور اس نے پہلی بار بیلا کو سمندر میں سیلنگ کی دعوت دی تھی۔ اور اسے اپنا کریو بنا لیا تھا۔ ساڑھے چار میل کی ریس میں اس کی کشتی کے علاوہ چھ اور کشتیاں بھی حصہ لے رہی تھیں۔

بیلا کا سکیپر (Skipper) کنور بلدیو سنگھ تھا۔ اور وہ ریس کرنے میں مشاق مانا جاتا تھا۔ اُس کا کریو (crew) بننے میں بیلا نے کسی قسم کی جھجھک نہ کی تھی۔ اوپن ریس تھی۔ چھ دوسری کشتیاں بھی ہوں گی۔ اُن کے سکیپر (Skipper) اور کریو (crew) بھی ہوں گے کسی قسم کا ڈر نہ تھا۔ اور پھر کنور سے ڈر کیسا؟ اِن چار دنوں میں بیلا کنور کے اس قدر قریب آگئی تھی۔ دل ہی دل میں اتنا اُسے پسند کرنے لگی تھی۔ کس طرح کنور اُس کی معمولی سے معمولی بات میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ اور اُس کی ہر خواہش کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ کس قدر مہذب اور سلیقہ مند انسان تھا۔ اگر اُسکی شادی اُس صابن بیچنے والے خشک اور بے رس آدمی کی بجائے اس شگفتہ مزاج ہمدرد انسان سے ہوئی ہوتی!

کئی بار بیلا کے دل میں یہ خیال آیا تھا۔ کئی بار اس خیال کو اِس نے اپنے دل میں دبا دیا تھا۔

پانٹون برج کو کراس کر کے جب وہ دونوں کشتی میں بیٹھنے لگے تو بیلا چونک کر رہ گئی۔ اُس نے دیکھا کہ کشتی پر کا نام بدل گیا ہے۔ جہاں پر بیلا تھا وہاں سفید حرفوں میں بیلا لکھا ہے!

"یہ کیا ہے؟" بیلا نے کانوں تک سُرخ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں!" کنور بلدیو سنگھ نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ بھی ایک نام ہے۔"

بیلا سر سے پاؤں تک کانپنے لگی۔ مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ کشتی میں بیٹھ گئی۔ کنور

اُسے بادبانی کشتی کے حصّے اور اُن کے نام سمجھانے لگا۔
دیکھو یہ ماسٹ بوم ہے۔ یہ جب بوم ہے۔ ماسٹ بوم کشتی کا سب سے بڑا بادبان ہے۔ یہ دوسرا چھوٹا بادبان جب بادبان کہلاتا ہے۔ یہ ماسٹ کے نیچے سنٹر بوٹ ہے۔ یہ دومن وزنی لوہے کا ہے۔
یہ رڈر اور ٹلر ہے (Rudder and Tiller.)"
"اس سے کیا کرتے ہیں؟" بیلا پوچھنے لگی۔
"اس سے کشتی کا رُخ بدلتے ہیں۔ اگر اسے دائیں طرف گھمائیں تو کشتی بائیں طرف گھومے گی اور بائیں طرف گھمائیں تو دائیں طرف گھومے گی۔ یعنی یہ عورت کی طرح ہے جس طرف گھومنے کو کہو اُس سے اُلٹ گھومے گی۔"
بیلا زور سے ہنسی۔ "واہ سبھی عورتیں کیا ایسی ہوتی ہیں؟ بہت شریر ہیں آپ!"
"کشتی کے بائیں طرف کو سٹار بورڈ کہا جاتا ہے۔ اور دائیں طرف کو پورٹ!" کنور بلدیو سنگھ بولا۔ "تیسرے بادبان کو توازن میں رکھنے کے لئے دو سٹیز (stays) ہیں۔ یہ بگ سٹے ہے (Big stay) اور یہ دوسرا فور سٹے (Fore stay) کہلاتا ہے۔"
"یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ میرا کام یہ ہوگا۔ اِس کشتی میں!" بیلا نے پہلی بار کنور کو "تم" کہہ دیا اور تم کہنے کے بعد وہ خود بخود چونک گئی۔ مگر خیریت گزری کنور نے اُس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ وہ اُس وقت جب شیٹ کی دونوں رسیاں دیکھ رہا تھا۔ وہ بیلا کی طرف مڑے بغیر بولا۔
"میرا کام ہے بڑے بادبان کو سنبھالنا۔ تمہارا کام ہے۔ جب بادبان

کو دیکھنا اور سنٹر بوٹ کو سنبھالنا۔"

کنور بیلا کو سمجھانے لگا اور سمجھانے کے لئے اُسے بیلا کے بہت قریب آنا پڑا۔ "دیکھو اسے بوم ٹک (Boom tuck) کہتے ہیں۔ اس رسی کو کنٹرول کرنے سے سنٹر بوٹ کو نیچے اوپر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ لوہے کی تار ہے۔ یہ ایک پُلی ہے۔ اِسے یوں گھماؤ۔ یوں کھینچو۔"

کبھی بیلا کے ہاتھ سے کنور کے ہاتھ ٹکرا جاتے۔ کبھی وہ اُسکے بازو اپنے بازو میں لیکر رسی کھینچنے کے گُر بتاتا۔ کبھی ایک کی سانس دوسرے کی سانس میں گھُل جاتی۔ "بہر حال تمہیں زیادہ کام نہیں کرنا پڑے گا۔" کنور نے بتایا۔ اور پھر اپنا ہنٹنگ کوٹ اُتار کر بیلا کو تھما کر کہا۔ "افوہ! گرمی لگ رہی ہے۔ خواہ مخواہ میں یہ ہنٹنگ کوٹ پہن کر آ گیا۔ تم سے اگر اور کچھ نہیں ہوتا تو میرا یہ کوٹ تو اپنے پاس رکھو!"۔

اتنے میں ریس شروع ہو گئی۔

شروع میں بیلا نے بہت غلطیاں کیں! کیونکہ وہ ایک ہاتھ میں کنور کا ہنٹنگ کوٹ تھامے ہوئی تھی۔ صرف ایک ہاتھ سے کتنا کام ہوتا ہے۔ کنور نے اُسے ایک بار ڈانٹ بھی دیا۔

"مجھ سے یہ کام نہیں ہوتا۔ میں تمہارا کوٹ بھی سنبھالوں اور جب سیل بھی دیکھوں!" بیلا نے تقریباً آبدیدہ ہو کر کہا۔

"لعنت بھیجو کوٹ پر! اِسے نیچے کشتی میں گرا دو یا پانی میں پھینک دو!" کنور نے بڑی لاپرواہی سے کہا۔ "کوٹ کی پرواہ مت کرو۔ سیل کو دیکھو۔ ریس ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے!"

اگلے پندرہ بیس منٹ بیلا کنور کے احکام کے مطابق کام کرتی رہی۔

لیکن جب اُسکے چہرے پر پسینے کے قطرے آگئے۔ اور اُسکے دونوں ہاتھ رسیوں کی گرفت سے زخمی ہو گئے۔ تو کنور نے اُسے ایک کونے میں بیٹھ جانے کا حکم دیا اور خود سب کام کرنے لگا۔ کرُیو کا بھی اور سکیپر کا بھی۔ بیلا شرمندہ ہو کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ پھر اُس نے کشتی کے اندر گرا ہوا ہنٹنگ کوٹ اُٹھالیا۔ اور اپنے گھٹنوں پر رکھ کر بیٹھ گئی۔!

عین اُسی وقت، ہنٹنگ کوٹ اُٹھاتے وقت اُس نے دیکھا کہ کوٹ کی باہر کی جیبوں میں، دونوں جیبوں میں سو سو کے بیشمار نوٹ بھرے ہوئے ہیں! چند لمحوں تک تو بیلا سناٹے میں آگئی! اُس نے کنور کی طرف دیکھا مگر کنور پسینے میں تر بتر سیلنگ کے جانکاہ کام میں مصروف تھا۔ بیلا نے کنور کی طرف سے نگاہیں ہٹالیں۔ اور ذرا رُخ موڑ کر چوری چوری نوٹ گننے کی کوشش کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے نوٹوں کو گننا چھوڑ دیا۔ مگر اُسے اتنا اندازہ ہو گیا کہ کم سے کم ۵۰ ہزار کے نوٹ تو ضرور ہوں گے!

کچھ دیر کے بعد بیلا نے مُسکرا کر کہا۔ "اگر میں تمہارا کوٹ پانی میں پھینکدوں تو؟"

"پھینکدو!" کنور نے انتہائی لاپرواہی سے کہا۔ "اس وقت مجھے بور مت کرو!"

"جانتے ہو۔ تمہارے کوٹ میں اِس وقت پچاس ہزار روپے پڑے ہیں!" بیلا نے فاتحانہ نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ؟" کنور نے یکایک اپنی غلطی پر پشیمان ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے پرسوں دوسرے کوٹ سے نکال کر روپے اِس کوٹ میں رکھدیئے تھے۔ پھر اپنی تجوری میں رکھنا یاد نہیں رہا۔ آج جلدی میں یہی کوٹ پہن کر چلا آیا۔"

"پچاس ہزار روپیہ یوں رکھ کر بھول جاتے ہو؟ کیا تمہاری دیکھ بھال

کرنیوالا اور کوئی نہیں ہے ؟" بیلا نے اُسے ذرا ہمدردی سے دھمکاتے ہوئے کہا۔

"اب میری کوئی بیوی تو ہے نہیں !" کنور ذرا تلخی سے بولا۔" اور جس عورت کو میں پسند کرتا ہوں وہ کسی دوسرے کی شادی شدہ نکلتی ہے !"

اتنا کہہ کر کنور پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اُس نے کچھ کہا ہی نہ تھا۔ مگر بیلا کا دل ہولے ہولے اندر ہی اندر پگھلنے لگا۔ ایک وہ صابن بیچنے والا ہے جو پیسے پیسے کا حساب مجھ سے لیتا ہے۔ ایک یہ فراخدل انسان ہے جو میری ایک نگاہ پر پچاس ہزار روپے پانی میں غرق کرنیکی توفیق رکھتا ہے۔ جو مجھے دل و جان سے چاہتا ہے۔ روپے ؟ روپے کی تو اُسے اتنی پرواہ ہی نہیں۔ اِسے تو یہاں تک معلوم نہیں کہ کونسی جیب میں کتنے روپے رکھے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ صابن کی ایک ایک ٹکیہ تک گن لیتا ہے حالانکہ کمپنی سے مُفت آتی ہیں !۔

بیلا نے بہت دیر کے بعد رُک رُک کر گھُٹے ہوئے لہجے میں کہا" تم چاہو تو میں تمہارے لئے ساری دُنیا چھوڑ سکتی ہوں "

کیسے اُسکے منہ سے نکل گیا ! کیوں کر اتنی بڑی بات اُس نے کہہ دی کہ وہ خود کانپ گئی اور شرم سے لال ہوکر نوٹوں والے کوٹ پر دُہری ہوگئی۔

"پھر بات کرینگے " کنور نے اُسی لاپرواہی سے کہا" اس وقت ریس نکلی جارہی ہے "

ہولے ہولے بیلا نوٹوں والے کوٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اُسے اس کوٹ پر بڑا پیار آنے لگا۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہمیشہ سے یہ کوٹ اُس کا تھا ہمیشہ سے صرف اُسی کا اس پر حق تھا۔

کنور بلدیو سنگھ نے بڑی پھُرتی سے جب ہیلٹ سے چھوٹے بادبان کو اونچا کیا اور پھر عقابی نگاہ سے آگے دیکھتے ہوئے بادبانی کشتی کو ریس میں سب سے آگے لے جاتے ہوئے زور سے کہا "وہ مارا - !"

کنور اور بیلا ریس جیت گئے تھے - بیلا کو جب کپ ملا تو سارے کلب کے ممبروں نے بڑے زور شور سے تالیاں بجائیں - پھر کنور اور بیلا کی اکٹھے تصویر لی گئی ! پھر اُن کا جام صحت پیا گیا - پھر بڑی دیر تک خوش گپیاں ہوتی رہیں - اور ایک دوسرے کے جام صحت پئے جاتے رہے !

چلتے وقت کنور نے بیلا سے پوچھا "آج شام کو کیا کر رہی ہو ؟"

"کچھ نہیں !"

"میں آؤں گا" کنور نے بڑے اطمینان سے اپنا ہنٹنگ کوٹ پہنتے ہوئے کہا "کہیں گھومنے چلیں گے - اکٹھے کھانا کھائیں گے !" اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کنور وہاں سے چلا گیا - بیلا لاؤنج کے ایک کونے میں اکیلی کھڑی خوف اور مسرت کے مِلے جلے احساس سے کانپنے لگی !

اگلے تین چار دِن اُن دونوں کے ایسی سُنہری دھوپ میں گزرے جہاں بادلوں کا سایہ نہ تھا - ایک دھیمی دھیمی جھلملاتی ہوئی خوشگوار روشنی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی - سمندر کا پانی نغمے سُنا رہا تھا - اور ہوا میں

ابابیلیں اُڑتی تھیں۔

پھر پروفل رائے چودھری آگیا۔ اور یکایک کنور ایسا ہو گیا جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ بیلا دھک سے رہ گئی۔ وہ چھُپ چھُپ کر کنور کے قریب جاتی مگر کنور وہاں سے ٹل جاتا۔ وہ اُسے بلانے کے لئے دزدیدہ نگاہوں سے تاکتی۔ اور کنور یوں دیکھتا جیسے وہ آنکھوں سے اندھا تھا اور کانوں سے بہرہ تھا۔ اور اپنے سینے میں دل کی بجائے صرف ایک ہنٹنگ کوٹ رکھتا تھا۔

دوسرے دن بیلا کی روتی ہوئی سوجی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر لالہ گردھاری لال نے آہستہ سے کنور سے پوچھا۔

"یار ہمیں بھی بتاؤ تمہارے کوٹ میں کیا ہے۔ کوئی گیدڑ سنگھی ہے۔ یا کوئی تعویذ ہے؟"

کنور بلدیو سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

"لالہ! اس کوٹ میں موجودہ زمانے کا سب سے بڑا تعویذ ہے۔!"

پھر کنور بلدیو سنگھ لالہ کے پاس سے اُٹھا اور رضیہ عطاء اللہ کے پاس جا بیٹھا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد یاروں نے سنا کہ اُن دونوں میں بڑے زور کی بحث چل رہی ہے۔

اور کنور بلدیو سنگھ میز پر ہاتھ مار مار کر کہہ رہا تھا۔

"اجی چھوڑو ٹیگور کو — ٹیگور بھی کوئی شاعر ہے؟ — مس رضیہ عطاء اللہ — میں آپ سے کہتا ہوں — اس دُنیا میں صرف

ایک شاعر ہے اور کنور رلبذیو سنگھ صرف ایک شاعر کا قائل ہے اور
وہ شاعر ہے ـــــــ اقبال ـــــ اقبال کا جواب دُنیا
میں نہیں ہے۔!"

بھیّا جی

چونی بھائی نہ اولڈ ہائٹ کلب کے ممبر تھے نہ اولڈ بورن کلب کے۔ لیکن دونوں کلبوں میں بڑی محبت اور تکریم سے بُلائے جاتے تھے۔ اور اب مسلسل دو سال سے یعنی جب سے اُنکے چھوٹے بھائی کا تقرر بطور انکم ٹیکس کمشنر ہوا تھا وہ کلب کی ہر بڑی محفل میں بطور ایک معزز مہمان کے ضرور شرکت کرتے تھے اس کیلئے اُنہیں کسی قسم کا تردّد نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہر روز خودبخود دعوتنامے اُن کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ آج کھیم جی کلیان جی نے اُنکی سالگرہ کے اعزاز میں کلب میں پچیس دوستوں کو بُلا رکھا ہے۔ توکل سٹینڈرڈ ڈپلائنگ مِل کے مالک سیٹھ دولت رام بانگانے اپنی مِل کا نیا سیکشن کھُل جانیکی خوشی میں ایک پارٹی دی ہے جس میں شرکت کرنے کیلئے سیٹھ بانگانے چونی بھائی کو ذاتی طور پر پانچ بار کہا ہے۔ پرسوں رانی ہیرا بائی جھاؤ نگر کے بوفے اور ڈانس میں چونی بھائی کو مدعو کیا ہے اور دعوتنامہ خود رانی صاحبہ کی بڑی لڑکی کملا بائی جھاؤ نگر نے اپنے ہاتھ سے چونی بھائی کے ہاتھ میں تھمایا تھا۔ بلکہ چونی بھائی کا ہاتھ دبا کر بڑے پیار اور اصرار اور ایک عجب دلکش ادا سے اِٹھلا کر کہا تھا۔ دیکھئے بھیّا جی! اگر آپ ہماری پارٹی میں نہیں آئے تو میں عمر بھر آپ سے نہیں بولوں گی اور چونی بھائی کملا بائی کی دلکش مسکراہٹ اُسکے ہاتھوں

کے نرم دباؤ اور اُسکے گلے میں پڑے ہوئے یاقوتی ہار کی چکاچوند سے ایک پالتو کتے کی طرح اپنے فقرے کی دم ہلاتے ہوئے بولے۔

"کیوں نہیں آؤں گا جی ای ای میں ایں ایں! میں توجرور آؤنگا آآ۔ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں اوں اوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اے اے جی ای ای؟ یہ تو وہی مجون ہو گیا۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے کھُدا کی کدرت ہے۔ کبھی ہم کو کبھی ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔ ایں اں جی ای ای"

چونی بھائی کو سب لوگ بھیاّ جی کہہ کر پکارتے تھے۔ چاہے لوگ اُن سے عمر میں چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں سب برابر اُنہیں بھیاّ جی کہہ کر پکارتے تھے اور ہر محفل میں اُن کی یکساں عزّت ہوتی تھی۔ اور اُن کی عزّت ایک خاص رکھ رکھاؤ سے ہوتی تھی۔ جیسے ہر محفل کے مہمانِ خصوصی وہی ہوں۔ اب یہ تو ہر ایک کو معلوم ہو چکا تھا کہ بھیاّ جی عورتوں کی محفل میں بہت چہکتے ہیں۔ کلب کے ممبروں کے الفاظ میں اُنہیں عورتوں کی کمپنی بہت پسند ہے اس لئے ہر محفل میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا کہ اُن کی سیٹ ایسی جگہ پر رکھی جائے جس کے اردگرد دوچار خوش شکل اور خوش مزاج عورتیں ضرور بیٹھی ہوں۔ یوں بھی یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ چونی بھائی کے سامنے بدمزاج سے بدمزاج حسینہ بھی یوں پوری ہنسی کھول کر مسکرانے لگتی ہے۔ جیسے اُسکے سامنے چونی بھائی نہ بیٹھے ہوں بلکہ بیش قیمت ڈائمنڈ کا ایک سیٹ رکھا ہو۔

بھیاّ جی یوں تو صوبہ گجرات کے رہنے والے تھے۔ لیکن اُن کی عمر کا بیشتر حصّہ شمالی ہند کی ایک فرم میں اکاؤنٹنٹی کرتے گزرا تھا۔ جہاں سے وہ آخر میں حساب کتاب میں کوئی شدید گڑبڑ ہو جانیکی وجہ سے نکالے گئے تھے۔ اب دو سال سے بمبئی میں مقیم تھے اور اپنے سانتا کروز کے آبائی گھر میں رہتے تھے۔

کیا کرتے تھے، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ البتہ گذشتہ دو سال سے برابر کلب میں دیکھے جاتے تھے۔ اُن کا قد ناٹا، جسم دُبلا اور آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ اور وہ اپنی ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں سے لگڑ بگڑ کی طرح چلتے تھے۔ لیکن کلب کے ممبروں کو اُنکی یہ بے ہنگم چال بھی پسند تھی۔ اور کنور بلدیو سنگھ نے ایک بار اُن کی چال کو سراہتے ہوئے کہا تھا۔ "بھیّا جی آپ نے کیا شاہانہ چال پائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں آپ ضرور پچھلے جنم میں کوئی راجہ ہونگے۔" ایک کنور کے منہ سے اپنی چال کی یہ تعریف سُن کر بھیّا جی خوشی میں آپے سے باہر ہو گئے تھے اور دوسرے دن سے اپنی ٹانگوں کو اور بھی پھیلا پھیلا کر چلنے لگے تھے۔ یہ صورت حال تھی تو مضحکہ خیز لیکن بھیّا جی لوگوں میں اس قدر مقبول تھے کہ کسی کو آج تک اُن پر ہنسنے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ شروع شروع میں آج سے دو سال پہلے دو ایک لوگوں نے اُن کی موجودگی پر ناک بھوں چڑھائی تھی۔ لیکن جونہی اُنہیں معلوم ہوا کہ بھیّا جی کا چھوٹا بھائی انکم ٹیکس کمشنر ہے۔ اُنھوں نے فوراً اپنا رویہ تبدیل کر لیا اور بھیّا جی سے اس طرح ہنسنے بولنے لگے جیسے وہ اُن کے اپنے ہی گھر کے ایک معزز رکن ہوں۔ شروع شروع میں کلب کے اندر داخل ہوتے ہی ان سے پوچھا جاتا تھا۔ آپ ممبر ہیں تو کارڈ دکھائیے۔ مہمان ہیں تو اپنے میزبان کا نام بتائیے۔ مگر اب اُن سے کسی قسم کی باز پُرس نہ ہوتی تھی۔ بلکہ نام پوچھنے والا اسٹیوارڈ اب اُنہیں جُھک کر فرشی سلام کرنے لگا تھا۔

بھیّا جی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ شمالی ہند میں متواتر پچیس سال رہنے سے اُنہیں اردو شاعری سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ کلب میں آنے کے بعد خود بھی شاعر بن گئے تھے۔ شروع شروع میں انھوں نے

غالبؔ، مومنؔ، ناسخؔ، داغؔ کے اشعار غالبؔ، مومنؔ، ناسخؔ، داغؔ کے نام سے سنائے تھے۔ اب ہر شاعر کا کلام اپنے نام سے سُناتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا کہ سیمنٹ، پلاسٹک اور لوہا بیچنے والے لکھ پتیوں کیلئے یہ نام بالکل اجنبی ہیں۔ جن لوگوں نے آج تک اپنی پاس بُک کے سوا اور کوئی کتاب نہ پڑھی ہو اُن کے سامنے شاعر بن جانا کونسا بڑا ظلم ہے؟ پھر جن لوگوں نے زندگی بھر انکم ٹیکس کی چوری کی ہو۔ وہ چند شعروں کی چوری پر بھلا کیوں اعتراض کرینگے! اس لئے کلب کے جو ممبر پڑھے لکھے بھی تھے وہ بھی انتہائی ذوق وشوق سے بھیّاجی سے اُن کا "تازہ کلام" سنتے تھے اور بڑھ بڑھ کر داد دیتے تھے۔

شاعری کے علاوہ وہ بھیّاجی ایک بہت بڑے مزاح نگار بھی تھے۔ جس محفل میں بیٹھتے دو تین تازہ لطیفے ضرور سُناتے جس پر محفل میں وہ بلند بانگ قہقہے بلند ہوتے کہ بھیّاجی خود اپنی فراستِ طبع پر حیران ہونے لگتے۔ آہستہ آہستہ اُن کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ بہترین لطیفہ گو اور شاعر ہیں۔ اور یہی اُنکی وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے وہ ہر محفل کی جان ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب ہر ماہ وہ بڑی پابندی سے انگریزی جوک بُک اور دوسرے لطیفوں کی کتابیں خریدتے تھے۔ اور اُن سے لطیفے یاد کر کے کلب میں سُناتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے ہمسائے امیر علی بیکسؔ سے دوستی کر رکھی تھی۔ جو خود ایک شاعر تھا اور جس کے پاس اردو زبان کے بہت سے رسالے آتے تھے۔ ہر روز صبح سیر کرتے ہوئے ہوئے بھیّاجی امیر علی کے مکان پر پہونچ جاتے تھے اور اس سے اچھے اچھے شعر سُن کر نقل کر لیتے تھے۔ اور پھر کلب میں آکر سُناتے تھے۔ ساری زندگی آنے پائیاں گنتے گنتے اور اپنے پاس

کی گھڑکیاں، دھمکیاں اور جھڑکیاں سہتے سہتے بھیّا جی کی زندگی میں اب یہ موقع آیا تھا۔ جب اُنہیں احساس ہوا کہ وہ ممتاز سماج کے ممتاز رُکن ہیں اور اپنی ہمہ گیر خوبصورت شخصیت کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ کاش اُنہیں پہلے سے معلوم ہوتا کہ وہ اتنی خوبیوں کے مالک ہیں تو وہ اکاؤنٹنٹی کیوں کرتے کسی بزنس میں پڑکر آج تک لکھ پتی کیوں نہ بن گئے۔

کلب کی پہلی منزل کے مین لاؤنج میں سیٹھ بانگا کی پارٹی زوروں پر تھی۔ جب بھیّا جی سفید ململ کی مہین دھوتی پر سیپ کے بٹنوں والی سفید اچکن پہنے ہوئے مسکراتے ہوئے لگڑ بگڑ کی چال چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ اُن کے داخل ہوتے ہی لاؤنج میں ایک تہلکہ سا مچ گیا۔

"یہاں آئیے بھیّا جی!"

"نہیں یہاں بیٹھئے۔!"

"میرے پاس"

"نہیں ہمارے پاس!"

"دیکھئے میں کب سے آپ کی راہ تک رہی ہوں!" رانی ہیرا بائی جھاؤ نکر اپنے نیلم کے بیش قیمت آویزے جھلاتے ہوئے بولی۔

بھیّا جی کا دُبلا پتلا جسم فخر و مسرت سے ایک کمان کی طرح تن گیا۔ اُنھوں نے پوری پارٹی پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور پھر رانی ہیرا بائی اور نیلوفر اور مسز جگن بھائی لبوا سا کی کرسیوں کے بیچ کی ایک خالی کرسی پر جا بیٹھے۔ اور لوگ

ہنسنے لگے۔" بھئی کمال ہے۔ جانے بھیا جی میں کیا گن ہیں، عورتیں تو ان پر گرتی ہیں، ہمیں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں!"

"راجہ اندر سے کوئی منتر سیکھ کے آئے ہیں" پرنس فیروز نے رشک آمیز لہجے میں اس طرح بلند آواز میں کہا کہ سب ہنسنے لگے۔ سب سے اونچی ہنسی خود بھیّا جی کی تھی۔

"کونسی وہسکی پئیں گے؟" سیٹھ بانگا نے خود آکر بھیّا جی سے پوچھا۔

راج کماری کملا بائی نے مشورہ دیا" دیکھئے میں شمپین پی رہی ہوں۔ آپ بھی پی لیجئے!"

"اچھا صاحب! ہم بھی شمپین ہی پئیں گے" بھیّا جی کملا بائی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولے۔

بھیّا جی کے لئے اسی وقت شمپین آگئی — مس نیلوفر نے ذرا جھک کر بھیّا جی کے اچکن کے بٹن دیکھے۔ انھیں چھو کر بولی۔

"موتیوں کے بٹن معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی نہیں" بھیّا جی نے اقرار کیا" یہ تو سیپ کے بٹن ہیں"

"سیپ کے بٹن ہیں؟ ہرگز نہیں۔ رانی ہیرا بائی جھاؤنکر بولیں۔ "مجھے تو موتی کے معلوم ہوتے ہیں۔!"

سیٹھ اگر چند جوہری اپنی سیٹ سے اٹھکر بھیّا جی کے قریب آگئے۔ غور سے اُنھوں نے سیپ کے بٹن دیکھ کر اور اُنھیں چھو کر کہا" اُستاد ہمیں بناتے ہو۔ یہ تو عدن کے موتی ہیں۔ خالص موتی ہیں۔ اور تم انہیں سیپ کا بتاتے ہو ہم نے کیا بیس برس جوہری رہ کر بھاڑ جھونکا ہے۔؟"

بھیّا جی ایک پُراسرار مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے آئے مگر منہ سے کچھ

نہیں بولے۔
اب اگر ان لوگوں کو غلط فہمی ہو رہی ہے تو میں اپنا بھرم کیوں نہ رکھ لوں؟
اُنھوں نے سوچا اور سوچ کر شیمپین کا ایک بہت بڑا گھونٹ پی لیا۔ اور رانی ہیرا بائی کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "آج کا تازہ لطیفہ سُنا۔ ؟"
"نہیں"
"بڑے مجے کا ہے"
"ضرور سنائیے!"
بھیّا جی نے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب چار پانچ اور لوگوں نے بھی لطیفہ سُننے پر آمادگی ظاہر کی تو بولے۔ "ڈاکٹر مہتہ جرا یہ لطیفہ سننا۔ بڑے مجے کا جوک ہے"
ڈاکٹر مہتہ فوراً ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تو بھیّا جی نے لطیفہ سنانا شروع کیا۔ ایک کوئی ڈاکٹر تھا اپنے یار ڈاکٹر پٹیل کی طرح۔ وہ ایک دِن ایک مریض کے گھر پہنچا تو اُسکے مریض نے گھبرا کر کہا۔ ڈاکٹر صاحب اِس گھر میں سب لوگوں کو ٹائی فائیڈ ہونے والا ہے! جب ڈاکٹر نے بولا۔ وہ کیسے؟ تو مریض بولا۔ وہ ایسے کہ میرے بیٹے نے میری نوکرانی کے منہ پر پیار کر لیا ہے۔ تو ڈاکٹر بولا۔ اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تو مریض بولا۔ گھبرانے کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی اُسی نوکرانی کے منہ پہ پیار کر لیا ہے۔ تو ڈاکٹر بولا۔ ہاں یہ ذرا ٹیڑھا معاملہ ہے۔ کیونکہ اب تم کو بھی ٹائیفائڈ ہو سکتا ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس پر وہ مریض بولا کہ ڈاکٹر صاحب قصّہ یہ ہے کہ نوکرانی کا پیار کرنے کے بعد میں نے اپنی عورت کے منہ پر پیار کر لیا۔ تو ڈاکٹر ایکدم گھبرا گیا۔ بولا۔ یہ تو بہت بری

بات ہوئی کیونکہ اب مجھ کو بھی ٹائیفائڈ ہو جائیگا!

ہاہا!

ہاہاہا!

ہاہاہاہا!

چاروں طرف تحسین کا دونگڑا برس گیا - فوراً ہی بھیاجی نے کسی فرمائش کے بغیر دوسرا لطیفہ سُنانا شروع کردیا۔

ایک خصم تھا - ایک بیوی تھی - بیوی بہت خوبصورت تھی۔ خصم کو اپنی بیوی پر شبہ تھا کہ وہ اِدھر اُدھر ضرور جاتی ہے - مگر اُسکو کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ اِس لیئے وہ ایک روج پندرہ روج کے لئے شہر سے باہر چلا گیا - اور جاتے وقت اپنے دوست سے کہہ گیا کہ مجھ کو اپنی بیوی پر شبہ ہے - تم ذرا اُس کا دھیان رکھنا - اُسکا پیچھا کرنا اور دیکھنا کہ وہ اِدھر اُدھر کہاں جاتی ہے ؟ میں اُسکی بدمعاشی کا اصلی ثبوت چاہتا ہوں - اُسکے دوست نے حامی بھرلی اور وہ چلا گیا - اور پندرہ روج کے بعد جب وہ واپس آیا تو اُس نے اپنے دوست سے پوچھا - تم نے کیا دیکھا - تو اُس کا دوست بولا - میں نے دیکھا کہ تمہارے جانے کے دو گھنٹے بعد ہی ایک بہت خوبصورت نوجوان تمہاری بیوی کے پاس آیا اور تمہاری بیوی نے بہت خوبصورت کپڑے پہنے اور اُسکے ساتھ ایک کلب میں چلی گئی - میں بھی چلا گیا - وہاں پر ان دونوں نے ڈرنک لیا - ڈانس کیا - پھر وہ دوسرے کلب میں گئے - وہاں بھی انھوں نے ڈرنک لیا اور ڈانس کیا - پھر وہ تیسرے کلب میں گئے وہاں بھی اُن لوگوں نے ڈرنک لیا ڈانس کیا - اب رات کے تین بج چکے تھے - اب وہ دونوں تمہارے گھر گئے - میں بھی چپکے سے اندر چلا گیا - وہ دونوں تمہارے ڈرائنگ روم میں بیٹھکر ڈرنک لیتے

رہے۔ پھر وہ بیڈ روم میں چلے گئے اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا اور میں آگے کچھ نہیں دیکھ سکا۔"

خصم ہاتھ ہلا کر بولا "یہی تو مصیبت ہے۔ اصلی ثبوت تو پھر بھی نہ ملا۔"

ہاہا!

ہاہاہا!

ہاہاہاہا!

"بھیّا جی! بھیّا جی!!" رانی ہیرا بائی کچھ شرما کر کچھ گھبرا کر کچھ بن کر بولیں۔

"تم بڑے شریر ہو۔ تم بڑے شریر ہو۔!!"

یہ کہہ کر انھوں نے پیار بھری سرزنش سے بھیّا جی کے ہاتھ پر ایک دھپّا دیا۔ اور بولیں "اب ہم تمہارے لطیفے نہیں سُنیں گے۔ اپنا تاجا کلام سناؤ بڑھیا والا"

بھیّا جی نے فوراً پہلو بدلا اور کھنکار کر بولے "سنو رانی جی۔ آج ہی یہ گجبل کہی ہے!"

من ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

"واہ! واہ!!" کنور بلدیو سنگھ لہرا کر بولے "من ناداں کا جواب نہیں" کنور بلدیو سنگھ نے سیٹھ ہیرا انند کی طرف مُڑ کر کہا جن کے بمبئی میں بیس کے قریب ڈرگ سٹور تھے۔ اور جو بمبئی میں انگریزی دوائیوں کی تجارت کے سب سے بڑے سوداگر سمجھے جاتے تھے "کچھ سمجھے آپ؟" سیٹھ ہیرا انند ذرا بہرے تھے۔ اس لئے کنور بلدیو سنگھ کے چلانے پر ذرا چونک کر بولے۔

"بھیاجی یہ گیت پھر پڑھنا! کنور بلدیو سنگھ اس کا مطلب مجھ سے پوچھتے ہیں۔"
بھیاجی نے اُسی تصرف کے ساتھ پھر پڑھا۔

من نادان تجھے ہوا کیا ہے۔
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

"بہت آسان سعر ہے!" سیٹھ ہیرا نند کنور بلدیو سنگھ کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ "ڈاکٹر بولتا ہے اے مریض تجھکو ہوا کیا ہے۔؟ مریض کہتا ہے آکھر اس درد کی دوا کیا ہے؟ اس پر ڈاکٹر کہتا ہے۔ من ناداں!"
"مگر من ناداں کیا ہے سیٹھ جی؟" کنور بلدیو سنگھ نے پھر پوچھا۔
"میرے خیال میں کوئی اُس جمانے کی پیٹنٹ دوا ہوگی! کیوں بھیاجی؟"
"آپ ٹھیک کہتے ہو!" بھیاجی نے سر ہلاکر کہا اور آگے پڑھنے لگے۔
"عرج کرتا ہوں۔!

میں بھی منہ میں جبان رکھتا ہوں!
کاس پوچھو کہ مانگتا کیا ہے؟"

کنور بلدیو سنگھ اب کے اپنے بائیں بازو بیٹھے ہوئے سیٹھ سکھانند سے پوچھا جو سیٹھ ہیرانند کے چھوٹے بھائی تھے۔ اور جو اس وقت بھیاجی کے شعروں پر سب سے زیادہ سر ہلا رہے تھے۔
"کیوں سیٹھ سکھانند جی! اس شعر کا مطلب کیا ہے۔ اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا؟"
سیٹھ سُکھانند جی کنور بلدیو کو سمجھانے لگے "بہت سرل اور سیدھا ہے۔ کنور جی! ساعر منہ میں جبان رکھتا ہے اور کچھ مانگتا ہے۔ اب تم بوجھو کہ وہ کوئی جو منہ میں جبان رکھتا ہے۔ کیا مانگ سکتا ہے۔"

"کیا مانگتا ہے؟" کنور جی نے پوچھا۔
"روٹی!" سکھانند نے فاتحانہ انداز سے شعر کا عقدہ حل کرتے ہوئے کنور جی سے کہا۔
کنور بلدیو سنگھ نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ ابھی بھیا جی غالب کے تیسرے شعر کا تیا پانچہ کرنے والے تھے کہ رانی ہیرا بائی جھاؤ نکرا انہیں محفل سے اُٹھا کر ایک طرف لے گئیں۔
"آپ سے ایک کام ہے بھیا جی!"
"فرمایئے رانی جی!"
"وہ میرے حساب کتاب میں بڑی گڑبڑ ہے۔ میرا اکاؤنٹنٹ نہایت ہی احمق ہے۔ بھگوان جانے کیسے حساب جوڑتا ہے کہ ہر سال انکم ٹیکس گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں اس سال بھی آپ میرا حساب کتاب ٹھیک کر دیں۔ ویسے تو اُس نے سب تیار کر کے رکھا ہے! مگر میں چاہتی ہوں کہ آپ اُسے ٹھیک طرح سے دیکھ لیں۔ اس کام کے میں تین ہزار روپے آپ کو دونگی۔ کل سے کام شروع کر دیجئے۔!"
"میں تو آپ کا داس ہوں رانی جی!" بھیا جی مسکراتے ہوئے بولے "آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں سب ٹھیک کر دونگا"
"پرسوں شام آپ میری کوٹھی پر آجایئے گا۔ میں سب سمجھا دوں گی اور پانچسو روپے ایڈوانس بھی دیدوں گی"
"اس کی کیا جرورت ہے رانی جی!"
"اسکی ہر ایک کو ضرورت ہوتی ہے بھیا جی!"
اتنے میں ایک کونے میں بھیا جی اور رانی جی کو بات کرتے دیکھ کر مس

نیلوفر چلائیں۔

"ارے بھیّا جی۔ وہاں کب سے کھڑے کیا میٹھی میٹھی باتیں کر رہے ہو رانی جی سے؟ اپنے سب حقوق اُسی کے نام مت لکھ دو۔ کچھ ہمارے لئے بھی رہنے دو۔ اِدھر آؤ!"

بھیّا جی مُسکراتے ہوئے مِس نیلوفر کی طرف روانہ ہوئے سیٹھ اُبٹن والا چلّا کر بولے "کیوں پرنس فیروز؟ بھیّا جی میں کیا بات ہے۔ ہر وقت خوبصورت عورتیں اُسے گھیرے رہتی ہیں"

"صاحب ہماری سمجھ میں خود کچھ نہیں آتا" پرنس فیروز ایک لمبے سگار سے راکھ جھاڑتے ہوئے بولے۔ اب تک تو سُن رکھا تھا کہ خوبصورت عورت مربّے کا ڈبّہ ہوتی ہے! جس کے گرد مرد چیونٹیوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔ مگر یہاں تو مربّے کا ڈبہ عورت کی بجائے ایک مرد ہے۔!"

"ہی اِز اے ڈارلنگ" (He is a darling!)
مِس نیلوفر نے پیار بھری نظروں سے بھیّا جی کی طرف دیکھتے ہوئے اِس طرح کہا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی!

جب پارٹی عین شباب پر تھی۔ تو سیٹھ اُبٹن والا نے اعلان کیا۔ کل سہ پہر میں اُنھوں نے وِہار جھیل پر ایک شاندار پک نک کا انتظام کیا ہے۔ دن میں مچھلیاں پکڑی جائینگی اور رات کو قوّالی ہوگی۔"

"مچھلیاں رات کو کیوں نہیں پکڑ سکتے ہے؟" نوجوان لکھپتی پِپی نے نیلوفر کی آنکھوں میں جھانک کر معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھسل جاتی ہیں!" نیلوفر اپنی آنکھوں کے آگے شمپین کا جام لا کر پپی سے بولی۔ پھر اُس کے ہونٹ شمپین میں ڈوب گئے۔ اور پپی سوچنے لگا

یہ شمپین میں بھیگے ہوئے گلابی ہونٹ کتنے پتلے اور باریک کٹے ہوئے ہیں۔ نیلوفر کس مشاقی سے ہلکا سا لپ سٹک لگاتی ہے کہ ہونٹوں کا ہر خم واضح ہو کر ابھر آتا ہے۔ آج کل کی عورتیں خود ہی تصویر ہیں خود ہی مصوّر ہیں۔ خود ہی مچھلی اور خود ہی ماہی گیر۔

"ارے بھیّا جی کا گلاس خالی ہے! شمپین لاؤ۔" سیٹھ اُبٹن والا چلا کر بولے پھر خود اپنے ہاتھ سے بھیّا جی کو جام دیتے ہوئے بولے: "کل شام آپ ضرور آئیں گے۔!"

"آؤں گا اور ایک کو ابی بھی لکھ کر لاؤں گا۔" بھیّا جی شمپین کا ساتواں گلاس چڑھاتے ہوئے بولے۔

"آپ یہیں کلب میں آجانا۔ میں آپ کو اپنی سٹیشن ویگن پر لے جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے!" بھیّا جی اطمینان سے سر ہلا کر بولے۔

دوسرے دن سہ پہر سے ایک گھنٹہ قبل ہی بھیّا جی کلب کے مین لاؤنج میں ایک کونے میں بیٹھے ہوئے پائے گئے۔ انھوں نے پرنس فیروز کو اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا:

"پرنس پھیروج! آؤ تم کو نیا جوک سناؤں! ایک تھا سیلز مین وہ ایک سٹور میں کالی پنیں بیچتا تھا۔!"

"کالی کیوں بیچتا تھا؟" پرنس فیروز نے بھڑک کر کہا۔ "اودی کیوں نہیں بیچتا تھا؟ نیلی کیوں نہیں بیچتا تھا؟ پیلی کیوں نہیں بیچتا تھا؟"

چونی بھائی ایک دم چونک گئے۔ آج تک پرنس فیروز نے اُن سے

اس طرح کبھی بات نہیں کی تھی۔ مگر وہ سادہ مزاج تھے اس لئے طرح دے گئے۔ ہنس کر بولے ": یار تم پورا جوک تو سُنو "

": یار ؟ کون یار ؟ کس کا یار ؟" پرنس فیروز نے بھڑک کر کہا۔" معاف کیجئے گا۔ چونی بھائی میں اِس قسم کی بے تکلفی پسند نہیں کرتا "

یہ کہکر پرنس فیروز وہاں سے چلے گئے اور چونی بھائی کا مُنہ حیرت سے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔ مگر آدمی موٹی کھال کے تھے۔ چند لمحوں کے بعد انھوں نے کنور بلدیو سنگھ کو گھیر لیا ": کنور جی میں نے آج کے فنکشن کے لئے نئی کوالی لکھی ہے! جرا سُنئے! عرج کیا ہے!"

": معاف کیجئے بھیّا جی۔ مجھے اس وقت فرصت نہیں ہے"۔ کنور بلدیو سنگھ ٹُنک کر بولے" اور پھر میں آپ کی کوالی سُن کر کیا کروں ؟ نہ اُس میں وزن ہوتا ہے نہ قافیہ درست" نہ شعر ٹھیک۔ نہ زبان۔ نہ محاورہ نہ روزمرہ! جیسی آپ کی قوالی ویسے آپ کے جوک۔ میں سخت بور ہو چکا ہوں آپ سے"

اتنا کہہ کر کنور بلدیو سنگھ اپنا انتہائی منغض اور بیزار سا چہرہ لے کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔!

بھیّا جی کا دماغ بھنّا گیا۔ کسی نے آج تک کلب میں اُنکی اس طرح بیعزتی نہیں کی تھی! پہلے پرنس فیروز پھر کنور بلدیو سنگھ۔ جانے ان لوگوں کو آج ہُوا کیا ہے ؟

تھوڑی دیر کے بعد انہیں رانی ہیرا بائی جھاؤ لکرا اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ بھیّا جی اپنی کرُسی پر بیٹھے بیٹھے فخر و مسرّت تن گئے۔ اور اتنے تنے کہ اُنہیں اُٹھ کر رانی جی کو تعظیم دینا بھی یاد نہیں رہا۔ مگر رانی ہیرا بائی اُن کے پاس آکر زیادہ دیر کے لئے نہیں رکیں۔ جلدی جلدی بولتے ہوئے

کہنے لگیں "کل شام کو آپ مت آیئے گا۔ میں ذرا ایک ضروری کام سے بمبئی سے باہر جا رہی ہوں۔ دو دِن کے بعد لوٹوں گی!"

"تو میں دو دن کے بعد آجاؤں گا"

"اسکی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود واپسی پر فون کر دوں گی۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف نہ کریں۔ بائی! بائی!!"

اتنا کہکر رانی جھاؤنکر بھی تیزی سے پلٹیں اور لاؤنج کے دوسرے کونے میں چلی گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب سیٹھ اُبٹن والا لاؤنج میں داخل ہوئے تو انھوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ لوگ مختلف ٹکریوں میں مختلف کونوں میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سیٹھ اُبٹن والا نے طائرانہ نگاہوں سے اپنے دوستوں کا جائزہ لیا جن کو وہ اپنے ساتھ پک نک پر لے جانے والے تھے۔

"ارے بھئی تیار ہو جاؤ۔ سب سامان تو ہو گیا۔ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ کنور جی۔ پرنس صاحب۔ سیٹھ بانگا۔ سکھانندجی۔ ہیرانندجی۔ نصروان جی۔ کملا بیٹی۔ مس نیلوفر۔ مس رضیہ۔۔۔۔۔"

سیٹھ اُبٹن والا ایک ایک کا نام لیکر بُلانے لگے۔ اور لوگوں کو اکٹھا کر کے کلب سے باہر گاڑیوں میں بھجوانے لگے۔ دو تین بار وہ چونی بھائی کی کرسی کے قریب سے گزر گئے! اُن کی نظر بھیّا جی پر نہیں پڑی۔ حالانکہ دو تین بار بھیّا جی نے اُن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ مگر اُدھر سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"بے چارہ سیٹھ کس قدر مصروف ہے!" چونی بھائی نے ہمدردی کے لہجے میں اپنے آپ سے کہا۔ اور پھر خود ہی اُٹھ کر اُنھوں نے دو تین بار سیٹھ اُبٹن والا کے گرد چکر کاٹے۔ مگر سیٹھ اس قدر مصروف تھا کہ اُن کی طرف

متوجہ نہ ہو سکا۔ آخر جب لاؤنج سے بہت سے آدمی نکل گئے اور صرف دو تین آدمی باقی رہ گئے تو بھیّا جی نے آخر سیٹھ اُبٹن والا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"میں تو آپ کی سٹیشن ویگن میں جاؤں گا ناں ؟" بھیّا جی نے سیٹھ سے پوچھا۔

"اوہ ساری !" سیٹھ اُبٹن والا نے بڑی رُکھائی سے کہا۔ میری سٹیشن ویگن میں تو اب جگہ ہی نہیں ہے !...... اے پاکسی سیٹھ دوسری طرف پلٹ کر بولا! "پاکسی۔ دیکھنا سب لیڈیز گاڑیوں میں بیٹھ گئیں۔ ذرا چیک اپ کر لو۔ میں ذرا بیئر چیک اپ کر لوں !"

سیٹھ اُبٹن والا اپنے دو تین ساتھیوں کو ساتھ لے کر لاؤنج سے باہر نکل گئے !

اب لاؤنج کے اندر مکمل سناٹا تھا۔ اتفاق سے ایک بھی ممبر موجود نہ تھا۔ سٹیوارڈ اپنے اسسٹنٹ کو لئے ایک کھڑکی میں کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ چونی بھائی مہتہ حیران و پریشان ہو کر ایک کونے میں ایک میز کے کنارے بیٹھ گئے اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگے !

اسسٹنٹ نے سٹیوارڈ سے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ آج بھیّا جی کی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے۔ کوئی اُن سے ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کرتا۔ آج وہ کلب میں اکیلے بیٹھے ہیں !"

"احمق ! کیا تم جانتے نہیں ہو" ایک طنز آمیز نگاہ سے بھیّا جی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا جو دور ایک کونے میں سر جھکائے اکیلے

بیٹھے تھے۔" آج بھیّا جی کے چھوٹے بھائی کا ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

"کون وہ جو انکم ٹیکس کمشنر تھا؟"

"ہاں! آج اُس کا تبادلہ بمبئی سے دلی ہو گیا ہے۔!"

"یہ بات۔؟" اسسٹنٹ ہولے ہولے سیٹی بجانے لگا۔

بھیّا جی نے اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھ کر اپنا دماغی توازن ٹھیک کرنے کے لئے جلدی سے ایک بیرے کو بُلایا اور بولے۔

"سکاچ کا ایک بڑا پیگ لاؤ"

"کس کے حساب میں جناب!" بیرے نے پوچھا "آپ تو ممبر نہیں ہیں!"

بھیّا جی چونک گئے اور چونک کر بھڑک گئے اور ذرا غصّے میں بولے۔

"کسی کے حساب میں لاؤ۔ روز تو لاتے ہو اور آج پوچھتے ہو کس کے حساب میں۔ جاؤ کسی کے حساب میں لاؤ۔ پرنس کے، کنور کے، سیٹھ اُٹین والا کے، کسی کے حساب میں ڈال کر لاؤ۔"

"آج سے آرڈر نہیں ہے صاحب!"

"کیا کہا۔؟" بھیّا گرج کر بولے اور کرسی سے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔!

"آج سے آرڈر نہیں ہے صاحب!" بیرہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے سر جھکا کر آہستہ سے بولا۔

کچھ دیر تک چونی بھائی۔ چُپ چاپ حیرت سے کھڑے بیرے کو

دیکھتے رہے۔ پھر جیسے اُن کی سمجھ میں آگیا۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور انھوں نے جلدی سے اپنا سر جھکا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کلب کے باہر چلے گئے۔"

اور اس دِن کے بعد وہ کبھی بورن کلب میں نہیں دیکھے گئے۔ پھر کبھی انہیں اِس گھر کا راستہ نہ ملا۔

شمّو

سنسکرت شاعری میں بھاری کولھوں والی عورت کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ ایسی کے کولھوں والی عورت کو گج تندنی، گج کامنی اور ایسے ہی توصیفی ناموں سے نوازا گیا ہے۔ شمّو کے کولہے بھی بہت بھاری تھے اور کمر بیحد پتلی تھی۔ اس لیئے جب وہ اپنے محور پر چلتی۔ تو سنسکرت کے شاعروں کے لئے دل سے بے اختیار داد نکلتی تھی۔

مگر شمّو کو سنسکرت شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ایک ایرانی لڑکی تھی جس کا اصلی نام شمشاد تھا اُس کا باپ ملبار ہِل سے نیچے چارپتی کے مقام پر ایک بہت بڑے سٹور کا مالک تھا۔ اُسے بھی سنسکرت شاعری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مگر وہ اپنی لڑکی کے بھاری کولھوں سے بیحد خائف تھا۔ اور ہر وقت جیب میں ایک پستول رکھتا تھا۔ اُن لوگوں کو ڈرانے کیلئے جو سنسکرت شاعری سے لطف اندوز ہونیکی تمنّا اپنے دل میں رکھتے ہیں۔

شمّو کو دیکھنے والے بھی سنسکرت شاعری سے بے بہرہ تھے۔ وہ اکثر جدید زمانے کے کالجوں کے فیشن زدہ لونڈے ہوتے تھے۔ جو شمّو کو دیکھنے کے لئے چارپتی کے نکڑ پر منڈلایا کرتے۔ اگر انُہیں سنسکرت شاعری سے ذرا بھی مس ہو تو ہم اُن سے کسی بہتر سلوک کی توقع رکھ سکتے تھے۔ مگر جانے

کیا بات تھی۔ یا تو اُن کی عقل کا قصور تھا یا شمو کی جوانی کا کہ اُسے دیکھتے ہی بے اختیار گلے سے سیٹی کی آواز نکلتی تھی۔ اور شمو جدھر سے گزر جاتی تھی۔ سیٹیاں سُنتی چلی جاتی تھی۔ اور اُن سے بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ تمام شریف اور بدصورت عورتیں مردوں کی سیٹیوں سے خائف اور منغض ہوتی ہیں۔ مگر شمو نہ شریف تھی نہ بدصورت!

پہلے پہل تو ایرانی سٹور کے مالک کیقباد کو کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک طویل عرصہ تک یعنی پہلے سولہ سترہ سال تک تو وہ شمشاد کو ایک ننھی سی بچی ہی سمجھتا رہا اور بیحد لاڈ پیار سے اُس کی ہر ضد پوری کرتا رہا۔ کیونکہ شمشاد کی ماں بچپن ہی میں فوت ہو چکی تھی۔ کیقباد نے بڑے جتن سے اپنی بیٹی کو پالا تھا اِس لئے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کی بچّی جسے وہ کل تک اپنے کندھے سے لگائے کھلاتا رہتا تھا آج یکایک اتنی جوان ہو چکی ہے۔ مگر جب کیقباد نے سیٹیوں کی آواز سُنی تو اُسکے دل میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اور اُس نے اپنا پستول نکال لیا۔ شمو کو اور شمو کے چاہنے والوں کو ڈرانے کے لئے۔

ویسے وہ بیحد سمجھدار انسان تھا۔ جیسا کہ ہر عمدہ بزنس مین ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ جوانی کو زیادہ عرصے تک پستول سے ڈرایا نہیں جا سکتا۔ وہ شمو کی شادی جلد سے جلد کر دینا چاہتا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ شمو کیلئے اُس نے جس لڑکے کا انتخاب کیا تھا۔ وہ ولایت میں برقی انجینئرنگ کا کورس کر رہا تھا۔ ابھی اُس کے آنے میں تین سال باقی تھے۔ اور یہ تین سال کیقباد کسی نہ کسی طرح پستول کے ڈراوے کے سہارے کاٹ دینا چاہتا تھا۔ اُدھر یہ لڑکی تھی کہ برقی انجینئرنگ کے آخری کورس سے بھی گزری

جا رہی تھی..... اور جلوۂ برق نما بن کر تماشائیوں کے قتلِ عام پر آمادہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز ڈرانے دھمکانے کے باوجود شمو بنارسی داس کے ساتھ بھاگ گئی۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ اور بنارسی ایک ایسے معزز امیر ہندوستانی کا لڑکا تھا جسے خود انگریزوں نے ایک پورے صوبہ کا گورنر بنا دیا تھا۔ گویا بنارسی داس صحیح معنوں میں لاٹ صاحب کا بچّہ تھا۔ اس لئے ذاتی وقار، رسوخ اور دولت کو استعمال کرنے کے باوجود وہ اپنی بیٹی دوبارہ حاصل نہ کر سکا اور شمشاد یعنی شمو بہت جلد مسز بنارسی داس بن گئی۔ اور شاما بائی کے نام سے پکاری جانے لگی۔ مگر یہ گھریلو نام بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ وہ بالآخر پھر شمو بن کر رہ گئی۔

بنارسی داس کے سارے ٹھاٹ ایک بگڑے رئیس کے اوباش بیٹے ایسے تھے۔ وہ بی۔ اے آنرز میں دو مرتبہ فیل ہو چکا تھا۔ دیکھنے میں خوبصورت لگتا تھا۔ مگر اندر سے اُس کی صحت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ شراب وہ پیتا تھا جوا وہ کھیلتا تھا ریس کا وہ شائق تھا۔ عورت بازی کا اُسے چسکا تھا۔ روپیہ بے تحاشا خرچ کرتا تھا۔ شمو سے اُسکی دوستی ایسی پُرانی نہ تھی۔ کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جانچ کر کوئی رائے قائم کر سکتے۔ بنارسی داس شمو کو دیکھتے ہی اُس کی چال پر عاشق ہو گیا۔ اُسکی بے تحاشا اُمڈتی ہوئی جوانی کا گرویدہ ہو گیا۔ بظاہر شمشاد نے بھی دیکھا کہ ایک خوبصورت خوش لباس ہنسنے کھیلنے والا نوجوان ہے۔ جو ایک بڑھیا شیورلیٹ میں بیٹھ کر اس سے ملنے آتا ہے۔ اس لیئے جب باپ نے پستول دکھایا تو بنارسی داس کو بھی غصّہ آگیا آخر وہ ایک ہندوستانی گورنر کا بیٹا ہے۔ اور اس سے بڑا عہدہ تو انگریزوں کے زمانے میں کسی کو نہیں ملتا ہے۔ اور اسی غصّے میں آکر اُس نے ایک روز

شمشاد کو زبردستی اغوا کر لیا۔ اِدھر لڑکی کے باپ کو اُدھر لڑکے کے باپ کو اُس وقت اطلاع ملی جب دونوں شادی کر چکے تھے۔ آخر کیقباد نے اس لیئے صبر کر لیا کہ اُس کا داماد ایک ہندوستانی گورنر کا بیٹا تھا۔ اور ہندوستانی گورنر کے خاندان نے اس لیئے صبر کر لیا کہ اِس سے پہلے اتنی خوبصورت لڑکی اُن کے گھر میں کبھی نہ آئی تھی۔ اب تک اُن کے گھر میں جتنی بہوئیں آئی تھیں اُنہیں دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ توری اور کریلے کھا کر پلتی رہی ہیں۔ ستیہ نارائن کی کتھائیں سُن کر بڑی ہوتی رہی ہیں۔

گھر کی بڑی بوڑھی عورتیں پہلے تو شمو کے حسن پر اترائیں۔ بعد میں خائف رہنے لگیں۔ خوف کی وجہ یہ بھی تھی کہ بنارسی داس مسلسل شراب نوشی اور اوباشی سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ہی ڈاکٹروں نے بچہ پیدا کرنے کے ناقابل قرار دیدیا۔ اسکے بعد وہ منزل آگئی جس میں مرد عورت سے دور بھاگتا ہے۔ شروع میں تو شمو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ اُسے اتنا معلوم تھا کہ جب کبھی رات کے سمے بنارسی داس کے بیڈروم کی طرف جانے لگتی۔ بنارسی داس کی ماں شمو کو جھڑک کر روک دیتی اور کہتیں "میرے بیٹے کو پڑھنے نہ دوگی۔ ؟ دیکھتی نہیں ہو وہ بی۔ اے کے فائنل میں ہے۔" سونے جاگتے اٹھتے بیٹھتے بیچاری ماں اپنے بیٹے کے راز کی حفاظت کرتی اور کبھی بہو کو اپنے بیٹے کے ساتھ اکیلا نہ چھوڑتی۔ دو سال بعد جب شمو کی سہیلیوں نے اُس سے پوچھا۔

"اری تیرے بچہ کیوں نہیں ہوتا؟" تو بیچاری رو کر بولی۔

"میں کیا کروں میرا خاوند تو بی۔ اے فائنل میں ہے"

اُس دن سے شمو کو سہیلوں میں اور سہیلیوں کی سہیلیوں میں یہ فقرہ

زبان زدعام ہوگیا۔ اب اُن کے حلقے میں کسی مرد کے لئے "کمزور" یا "کھوکھلا" یا کوئی ایسا خلاف تہذیب لفظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے۔

"اجی! وہ تو بی۔ اے فائنل میں ہے بے چارہ!"

شمو نے مزید ایک سال صبر کیا۔ جب دیکھا کہ بنارسی داس اُس علاج معالجے کے بعد بھی کسی طرح بی۔ اے کا امتحان پاس نہیں کرسکتا تو اُس نے خود ایم۔ اے کا داخلہ لے لیا۔ یعنی بورین کلب کی ممبر بن گئی۔ انگریزوں کا زمانہ تھا۔ باپ ہندوستانی گورنر تھا۔ اس لئے اکثر و بیشتر ممبروں کی دبی دبی مخالفت کے باوجود بنارسی داس اور شمو بورین کلب کے ممبر چُن لئے گئے اس واقعہ کے ایک سال بعد بنارسی داس کا باپ گورنر نہ رہا۔ نہ سرکاری حلقوں میں اس کی وہ پوزیشن رہی۔ نہ وہ وقار رہا۔ مگر بنارسی داس مستقل ممبر بن چکا تھا۔ اب کیا ہوسکتا تھا؟

کلب کے بیشتر ممبر بنارسی داس کو پسند نہ کرتے تھے۔ ایک تو وہ نوعمر تھا اور کلب کے بیشتر ممبروں کی عمر چالیس سے اوپر تھی۔ پھر اُس کی عادتیں بھی بگڑی ہوئی تھیں۔ کلب میں وہ اپنے وقت کا زیادہ حصّہ شراب نوشی میں صرف کرتا تھا۔ شراب تو دوسرے لوگ بھی پیتے تھے اور بہت پیتے تھے۔ مگر سلیقے سے۔ بنارسی داس اکثر شراب پی کر ہنگامے پر اُتر آتا تھا۔ اُسے کلب کے سکریٹری سے دو تین مرتبہ وارننگ بھی مل چکی تھی۔

مگر اب بنارسی داس کرے تو کیا کرے۔ جس نوجوان دولتمند کی زندگی سے عورت نکل جائے وہ اگر شراب نہ پئے تو کیا کرے۔؟

البتہ شمو کلب میں بے حد پاپولر ہو رہی تھی۔ شمو کو مرد شروع ہی
سے پسند تھے۔ کلب میں آکر تو اُس نے عورتوں سے بہت کم واسطہ
رکھا تھا۔ اور دن رات مردوں میں گھری رہتی تھی۔ چھیڑ چھاڑ بول
چال، گپ بازی، شوخی، اِتراہٹ میں اُس کا جواب نہ تھا۔ ہمیشہ
اُس کی ٹیبل کے گرد مردوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔

بنارسی داس جلتا بھُنتا بار کے ایک اونچے سٹول پر بیٹھ کر
شراب پیتا رہتا۔ بے چارہ بی۔ اے فائنل ہی جو تھا۔

شمّو مردوں کی محفل میں چہکتی رہتی اور زور زور کے قہقہے لگاتی۔
کبھی کسی کا کان کھینچ لیتی، کسی کے دھپ لگا دیتی۔ اپنی جھوٹی سائیڈر
کسی کو پیش کر دیتی۔ کسی کی جھوٹی وہسکی میں سے ایک گھونٹ پی جاتی۔
مگر کلب کے کسی ممبر پر اُس کی نظر نہ تھی۔ کیونکہ کلب میں جتنے نوعمر تھے
وہ شمو کو بنارسی داس کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ وہی اطوار، وہی لباس
وہی بگڑی ہوئی صحت۔ اپنے دلی خوف اور نفسیاتی دھچکے کی بنا پر
شمو کو ہر نوجوان بی۔ اے فائنل میں نظر آتا تھا۔ اور جو نوعمر نہ
تھے وہ اپنے ادھیڑپنے اور بڑھاپے کی بنا پر شمو کو پسند نہ آتے تھے۔
چند سال کے بعد کلب کے تجربہ کار ممبروں نے محسوس کر لیا کہ شمّو آسانی
سے قابو میں آنے والی چڑیا نہیں ہے۔

اتفاق سے شمو نے اپنی محبت کے لئے جس نوجوان کو چُنا وہ ایک سرے
سے کلب کا ممبر ہی نہ تھا۔ بلکہ کلب میں ملازم تھا۔ وہ کلب کے دھوبی
کا لڑکا تھا۔ پہلے تو کلب کے کپڑے دھوتا رہا۔ اپنے باپ کے ساتھ۔
جب بڑا ہوا تو کلب کا بیرا بن گیا سیدھا سادا ایک ہوشیار اور نوجوان اور

کسرتی بدن کا بیرا تھا۔ اور لوگوں کو خوش کرنے کے ڈھنگ سیکھ گیا تھا۔ مگر رامو آگے بڑھنا چاہتا تھا کسی طرح بیرہ گیری پر قناعت نہ کر سکتا تھا۔ اس لئے اُس نے کلب کے اوقات سے باہر سنوکر سیکھنا شروع کر دیا۔ دو سال کی مشق کے بعد وہ اس کھیل میں اس قدر طاق ہو گیا کہ کلب نے اپنے بڑے سنوکر کھلانے والے ملازم کو الگ کر کے رامو کو ڈیڑھ سو روپے پر کلب کے ممبروں کو سنوکر سکھانے اور کھلانے پر نوکر رکھ لیا۔ اب رامو کلب کے ممبروں کو سنوکر سکھاتا تھا۔ قمیص اور پتلون پہنتا تھا۔ انگریزی بال رکھتا تھا۔ اور انگریزی بولتا بھی تھا۔ اُس کا رنگ نکھر آیا تھا۔ اس کے شانے چوڑے تھے۔ بازو مضبوط تھے۔ سینہ فراخ تھا اور ہنسی دلکش تھی۔ اور جب وہ قریب ہوتا تو سیکھنے والی لڑکیوں کو اس کے جسم سے ایک عجیب سی مہک آتی تھی۔ اور مرد بھی اُس کے کھلے ہوئے پُراعتماد اور روشن چہرے کو بیحد پسند کرتے تھے۔

شمو دل ہی دل میں اُس پر ریجھ گئی۔ پہلے وہ سنوکر کبھی نہیں کھیلتی تھی۔ سارا وقت اِدھر اُدھر خوش گپیوں میں، سیلنگ میں یا کارڈ روم میں جا کر تاش کی بازیوں میں صرف کر دیتی تھی۔ ہولے ہولے اب اُس کا بیشتر وقت سنوکر کے کمرے میں صرف ہونے لگا۔ اور دن بدن وہ سنوکر کے کھیل میں مشاق ہوتی گئی۔

اِنہی دنوں میں بنارسی داس کو ایک دفعہ اپنی بزنس کے سلسلہ میں کلکتہ جانا پڑا۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ کلکتے سے لوٹا تو دفتر میں اُسے کلب کی طرف سے ایک چٹھی ملی۔ جس میں اس سے استدعا کی گئی تھی کہ وہ کلب کی رُکنیت سے خود بخود دست بردار ہو جائے۔

چٹھی میں کوئی وجہ درج نہ تھی — مگر جب بنارسی داس نے کلب میں جاکر پتہ چلایا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے جانے کے دو روز بعد اُس کی بیوی سنوکر کے کمرے میں راموں کے ساتھ اکیلی پائی گئی۔

سنوکر کے کمرے کے دونوں دروازے اندر سے بند تھے۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ کلب کے بیشتر ممبر جا چکے تھے۔ مگر جو لوگ ابھی گئے نہ تھے اُنہیں جب پتہ چلا کہ اس طرح کا معاملہ ہے تو اُنھوں نے سنوکر کے روم کا دونوں طرف سے محاصرہ کر لیا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔

اور جب پھر بھی دروازہ نہ کھُلا تو اُنھوں نے دروازہ دھکے مار مار کر توڑ دیا۔ کمرے کے اندر سے شمو اور رامو برآمد ہو گئے۔ دس بارہ کلب کے معزز اراکین اس واقعے کے چشم دید گواہ موجود ہیں۔

"ہماری کلب کی تاریخ میں کبھی ایسا واقع نہیں ہوا" سکریٹری نے تاسف آمیز لہجے میں سر ہلا کر کہا۔

"ہمیں بے حد افسوس ہے۔ مگر اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ آپ اور آپ کی مسز دونوں ہمارے کلب سے مستعفی ہو جائیں"

بنارسی داس ایک غیرت مند نوجوان تھا۔ اُس کی غیرت کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ فی الفور کلب کی ممبری چھوڑ دے۔ چنانچہ اس نے یہی کیا۔ اور اپنی بیوی کو لے کر نہ صرف کلب سے بلکہ چند ماہ کے لئے بمبئی سے باہر

چلا گیا۔

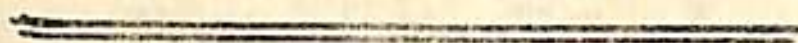
رامو کو کلب نے نوکری سے برخاست کر دیا۔ اور اب کوئی دوسرا کلب اُسے نوکر رکھنے کو تیار نہیں ہے۔ لہٰذا اب وہ اپنے دھوبی باپ کے ساتھ پھر کپڑے دھوتا ہے۔

اس واقعے پر سب سے دلچسپ تبصرہ مسز بانگا کا ہے۔ جب رضیہ عطاءاللہ نے بھڑک کر کہا۔

"اب یہ کلب کی بڑی زیادتی ہے۔ کلب کو ممبروں کے پرائیویٹ اخلاق کو پرکھنے کا کوئی حق نہیں۔ میں اسی کلب کے ایسے ایسے ممبروں کو جانتی ہوں۔ جو اسی کلب میں کیا کچھ نہیں کر گزرتے ہیں"

"کرنے کو وہ سب کچھ کرتے ہیں!" مسز بانگا بولیں۔

"مگر ایک نوکر کے ساتھ ؟ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے ملازم کے ساتھ ؟ ؟ میں کہتی ہوں اگر کچھ کرنا ہی تھا تو کیا کلب کے دوسرے ممبر مر گئے تھے۔ ؟"



کاشی بائی

مسز دیواس جب ممبر بننے کے لئے پہلی بار کلب میں داخل ہوئیں ۔ تو لیڈیز کلوک روم کے دروازے پر ایک عورت کو کھڑی دیکھ کر گھبرا گئیں ۔

"کون ہے یہ ؟"

"یہ کاشی بائی ہے !" رضیہ عطاء اللہ نے مسکرا کر کہا ۔

"بڑی خوبصورت ہے ۔!" مسز دیواس کے منہ سے بے اختیار نکلا ۔

کاشی بائی واقعی بیحد خوبصورت تھی ۔ وہ اس وقت لیڈیز کلوک روم کے دروازے پر ایک اودی بھوری مراٹھی ساڑھی پہنے سبز رنگ کے کھن کے بلاؤز کے اوپر ایک سونے کا لاکٹ لٹکائے عجیب دلکش ادا سے گردن نیوڑھائے دیکھ رہی تھی ۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی رسیلے ہونٹوں والی کاشی بائی اپنے جوڑے میں پھولوں کی وینی ٹھیک کر رہی تھی ۔

"کیا یہ کلب کی مستقل ممبر ہے ؟" مسز دیواس نے سرگوشی کے لہجے میں رضیہ سے پوچھا ۔

"یہی سمجھنا چاہیئے ۔" رضیہ نے بیحد محظوظ ہو کر کہا ۔

"اس کے آگے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا ۔" مسز دیواس نے آہستہ سے اقرار

کیا "کیا کرتی ہے۔ ؟" مسز دیواس نے پھر پوچھا۔

"یہ دوسروں کے چراغ جلاتی ہے" رضیہ نے پُراسرار لہجے میں مسز دیواس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ ؟"

"لیڈیز کلوک روم کے اندر چلو۔ تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا"

جب وہ دونوں لیڈیز کلوک روم میں داخل ہوئیں تو کاشی بائی دروازے سے پرے ہٹ گئی اور جب وہ دونوں عورتیں اندر آگئیں تو سر جھکا کر اُن کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔

بورن کلب کا لیڈیز کلوک روم ایک عجیب و غریب دنیا ہے۔ اس دنیا میں آئینوں کی بڑی اہمیت ہے۔ بڑے بڑے دیوار گیر آئینے چاروں طرف لگے ہوتے ہیں۔ جن کے سامنے دس بارہ خواتین ہر وقت کھڑی اپنے چہرے کی مرمت میں لگی رہتی ہیں۔ کوئی چہرے پر فونڈیشن لگا رہی ہے۔ تو کوئی لپ سٹک لگا رہی ہے۔ کوئی صرف پیٹی کوٹ پہنے انتہائی پریشانی میں گھوم رہی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہتی ہے۔

"کاشی بائی میری باڈی کدھر ہے۔ ؟"

"کاشی بائی دیکھنا میری ساڑھی پیچھے سے اوپر تو اُٹھی ہوئی نہیں ہے۔ ؟"

"کاشی بائی ذرا ایکر اگرم کر دو۔ موم بتی کہاں ہے۔ ؟"

"وہ میرا جُوڑا لانا کاشی بائی"

"میری نیل پالش کہاں چلی گئی۔ ؟"

"کاشی بائی میری ساڑھی کا فال دیکھو"

"اِس بلاؤز کو استری کر دو۔"
"یہ ٹانکا لگا دو۔"
"یہ ریچ بٹن نکل گیا ہے۔"
"میرے گجرے۔؟"
"میری چوڑیاں ؟
"کاشی بائی!"
"کاشی بائی
ایک کاشی بائی اور دس عورتیں۔ اور ہر عمر ہر نسل اور ہر رنگ کی عورتیں مگر کاشی بائی ہر ایک کا کام خندہ پیشانی سے کرتی جاتی ہے۔ گیارہ سال سے وہ کلب میں ہی کام کر رہی ہے۔ وہ لیڈیز کلوک روم کی انچارج ہے۔ اور جتنا مشکل کام اُس کا ہے۔ دُنیا میں کسی کا نہیں ہو سکتا۔ مگر گیارہ سال سے وہ کامل اعتماد اور خوش اسلوبی سے اس کام کو کر رہی ہے۔ وہ خواتین کے کپڑے تہ کر کے رکھتی ہے۔ اُن پر استری کرتی ہے۔ اُن کے میک اپ میں مدد دیتی ہے۔ اُن کی ساڑھی کا فال درست کرتی ہے۔ بیچ بیچ میں اُن کا اعتماد بڑھانے کے لئے اُنکے حسن کی تعریف بھی کرتی جاتی ہے۔ چاہے وہ پندرہ برس کی لڑکی ہو یا پچاس برس کی بڑھیا۔ عورت ہمیشہ اپنے آپ کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔ اِس کلوک روم سے باہر مردوں کی نگاہیں ہیں جو تولتی ہیں۔ پرکھتی ہیں۔ اور قیمت لگاتی ہیں۔ اِس لئے تیار ہو کر کیل کانٹے سے لیس ہو کر مکمّل طور پر چاق وچوبند ہو کر کلوک روم سے باہر نکلنا پڑتا ہے۔ اِس کے لئے کاشی بائی کا وجود بیحد ضروری ہے۔ ایک مرد کے لئے ایک عورت کو سنبھالنا کس قدر مشکل کام ہے۔ اِسے جاننے والے جانتے ہیں۔ کاشی بائی ایک

عورت ہو کر دس عورتوں کو کیسے سنبھالتی ہے۔ یہ اتنا ہی بڑا معجزہ ہے جتنا انسان کا چاند پر جانا۔ مگر کاشی بائی مسلسل گیارہ سال سے یہی معجزہ کر کے دکھاتی چلی آرہی ہے۔ آج تک اُس نے کسی میم صاحب کو ناراض نہیں کیا۔ کسی خاتون کو آزردہ نہیں کیا۔ کبھی اپنے کام سے بیزاری ظاہر نہیں کی۔ وہ ہر وقت اپنے کام میں جُتی رہتی ہے۔ مگر مگن ہو کر، دلشاد ہو کر خندہ جبین ہو کر۔ شاید اُس کے اعصاب لوہے کے بنے ہوئے ہیں۔

گیارہ سال پہلے جب وہ اِس کلب میں ملازم ہوئی تھی۔ اس وقت اُس کی عمر صرف بیس سال کی تھی۔ اُسکی گود میں اُس وقت دو سال کی ایک بچی تھی۔ جو اب آٹھویں جماعت میں پڑھ رہی ہے۔

کاشی بائی جب کلب میں ملازم ہوئی تھی تو لوگوں کو یقین تھا کہ یہ لڑکی زیادہ دیر تک کلب میں نہیں ٹِکے گی۔ کیونکہ وہ اس قدر خوبصورت تھی۔ اِس قدر بھولی، معصوم اور شرمیلی تھی کہ گمان تھا کہ کلب کے جہاندیدہ اور تجربہ کار اُستاد لوگ اُسے گھاٹ پر لگا دیں گے۔

سب سے پہلے پرنس فیروز نے کوشش کی تھی۔ حرفِ مدعا سُن کر کاشی بائی نے کہا تھا "میرا مالک موجود ہے صاحب! اور ایک عورت کے دو مالک نہیں ہوتے۔"

"بڑی احمق ہے تو!" پرنس فیروز نے کہا "آج کل دس بھی ہو سکتے ہیں۔ خیر اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے۔ اتنا بتا دے تیرا مالک کیا کرتا ہے؟"

"فوج میں ہے۔"

"فوج میں کیا کرتا ہے؟"

"لڑائی لڑتا ہے۔"

"تیرا مطلب ہے وہ جنگی محاذ پر ہے۔؟" پرنس فیروز نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"ہاں وہ سپاہی ہے۔" کاشی بائی فخریہ لہجہ میں بولی۔"جس مالک نے میرا گھر چلانے کیلئے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ سرکار۔؟ اس کی بیوی اپنی محبت کیسے بیچ دیگی؟"

دوسری کوشش سر غلام محمد نے کی تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور کاشی بائی کا خاوند انتت لام سے واپس نہیں آیا تھا۔ اُس کا نام مرنیوالوں کی فہرست میں نہ تھا۔ نہ واپس آنیوالوں کی فہرست میں۔ وہ Missing کی لسٹ پر تھا۔ اُسے کھوئے ہوئے اب چار سال ہو چکے تھے۔

"ناں! ناں!! سرکار!!!" کاشی بائی نے سر جھکا کر سر غلام محمد کو جواب دیا۔"میں اپنا دھرم نہ بدلوں گی۔"

"لوگ تو چار پیسے کیلئے اپنا خدا بیچ دیتے ہیں۔ تو کیا اپنی ساری زندگی کی خوشی کی خاطر اور اپنی بچی کے آرام کے لئے اپنا مذہب تبدیل نہیں کر سکتی؟ اِن باتوں میں اب رکھا کیا ہے؟"

"میرا دھرم تو وہی ہے جو میرے مالک کا دھرم تھا۔ اور جب وہ واپس آئیگا تو مجھے اُسی دھرم میں دیکھنا چاہیگا۔"

"پگلی اب وہ کیا واپس آئے گا۔" سر غلام محمد نے کہا۔"چار سال ہو گئے۔ اُسے کھوئے ہوئے۔ اگر زندہ ہوتا تو اب تک واپس آجاتا۔!"

"میرا دل کہتا ہے وہ ضرور واپس آئے گا۔" کاشی بائی نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔

تیسری سنجیدہ کوشش سیٹھ بانگا نے کی تھی۔

"میں ہر چیز تمہیں دونگا۔"

"شادی تو نہ کروگے مجھ سے؟" کاشی بائی نے پوچھا۔

"شادی کی ضرورت کیا ہے۔ میں تم کو اپنے نوکر خانے میں دو کمرے دیدوں گا۔ پورے فرنیچر اور سامان سے اپ ٹو ڈیٹ۔ پندرہ ہزار روپیہ تیرے اکاؤنٹ میں اور بیس ہزار روپیہ تیری بچّی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گا۔ پہلے دن نہیں - آج - ابھی - ایک بار ہاں کر دے۔"

"اور تجھ سے جو میرے بچّے ہوں گے اُن کو کیا تو اپنا نام بھی دے گا - ؟"

"نام ؟ نام ؟؟ - نام میں کیا رکھا ہے۔ ؟" سیٹھ بانگا نے گڑگڑا کر کہا۔

"کون اُن کا باپ ہوگا۔ ؟ کِس کے کندھے پر چڑھ کر وہ بازار جائینگے رات کو کس کی گود میں مچل کر کہانی سننے کے لئے بے تاب ہوں گے۔ ؟ سکول میں کِس نام سے پُکارے جائیں گے۔ ؟ بڑے ہو کر جب اُنہیں پتہ چلے گا۔ تو وہ کِس کے منہ پر تھوکیں گے۔ ؟ میرے منہ پر کہ تمہارے منہ پر۔ سیٹھ جی ! نام میں بہت کچھ ہوتا ہے۔"

"اری کم بخت کیوں اپنی جوانی خراب کرتی ہے۔ !"

"جوانی تو دوسری باتوں سے خراب ہوتی ہے سیٹھ جی ! اپنے گھر والے کیلئے جو ہر دم میرے دل میں بستا ہے۔ اپنی بچّی کے باپ کے لئے انتظار کرنے میں کیا خرابی ہے۔ ؟"

"انت اب کبھی نہیں آئیگا۔ سات سال تو ہو گئے اُسے کھوئے ہوئے۔ اتنے عرصے کے بعد تو شاستروں نے بھی اجازت دے رکھی ہے !"

"اجازت دے رکھی ہے مگر مجبور تو نہیں کیا ہے۔ جیسے آپ مجھے مجبور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

سیٹھ بانگا شرمندہ ہو کر پلٹ گئے۔

آخری کوشش کنور بلدیو سنگھ نے کی تھی۔

"دس سال ہوئے ہیں ڈارلنگ تمہارے اننت کو گئے ہوئے۔ اُس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں۔ میرا خیال ہے۔ یا تو وہ کہیں کسی مورچے پر مر کھپ گیا ہوگا۔ یا دشمنوں کے ہتّے چڑھ گیا ہوگا۔ اور انھوں نے اُسے مار ڈالا ہوگا۔ یا وہ اٹلی وٹلی میں کہیں کسی اطالوی لڑکی سے شادی کر کے بس گیا ہوگا۔ تم اپنے اس شباب اور کِھلے ہوئے حسُن کو کیوں برباد کرتی ہو"

"پھر میں کیا کروں۔ ؟"

"میرے ساتھ آجاؤ"

"آپ تو ان دس سالوں میں دس لڑکیاں بدل چکے ہیں"

"میں تمہاری لڑکی کو اڈاپٹ کر لوں گا۔ یقین نہ آئے تو پہلے لکھوا لو"

"اور مجھے کیا دو گے۔ ؟" کاشی بائی ہنس کر پوچھنے لگی۔

"پچاس ہزار"

"وہی جو ہر وقت تمہارے ہنٹنگ کوٹ میں رہتا ہے۔ جس کی جھلک دکھا کر تم جانے کتنی عورتوں کی عصمت لوٹ چکے ہو۔ اور جس میں سے آج تک تم نے ایک دس کا نوٹ بھی خرچ نہیں کیا؟"

"میں ابھی یہ پچاس ہزار تمہارے ہاتھ میں تھمائے دیتا ہوں — تاکہ تمہیں میری صدق دلی اور نیک نیتی پر شبہ نہ رہے"

کنور بلدیو سنگھ نے یہ کہہ کر بڑی بے خوفی سے اپنے کوٹ کی جیبوں میں

ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی گڈیاں باہر نکال کر کاشی بائی کے ہاتھ میں تھما دیں۔

کاشی بائی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے رسیلے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی بڑی آنکھیں ایک عجیب ناز و ادا سے جھپکائیں اور کنور بلدیو سنگھ کی طرف شوخی سے تاکتے ہوئے بولی۔

"یہ نوٹ میرے ہیں۔؟"

"ہاں تمہارے ہیں"

"میں ان کا جو جی چاہے کر سکتی ہوں۔؟"

"بالکل"

وہ دونوں اس وقت کلب کے جاپانی گارڈن میں کھڑے تھے۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ کلب کے سب ممبر رخصت ہو چکے تھے۔ کاشی بائی کا دستور تھا کہ وہ رخصت ہوتے وقت کلوک روم کے دروازے کو تالا لگا کے باہر مین پورچ میں جانے کے بجائے اُدھر جاپانی گارڈن میں نکل آتی تھی۔ اور اس کے خوبصورت محرابوں والے پُل سے گزر کر دوسری طرف نکل جاتی تھی۔ جدھر لکشمی روڈ واقع تھی۔ جہاں وہ ایک گیراج میں اپنی لڑکی کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ اس کا روز کا دستور تھا۔ بلاشبہ کنور بلدیو سنگھ نے بہت عمدہ موقعہ تلاش کیا تھا۔

اس وقت باغ میں مکمل سنّاٹا تھا۔ محراب دار پُل کے اوپر جاپانی لیمپوں کی رنگین روشنیاں نہر کے ہولے ہولے بہتے ہوئے

پانی میں یوں تھر تھرا رہی تھیں جیسے مختلف رنگ کے جذبے عورت کے دل میں تھر تھراتے ہیں۔ رات کی رانی کی ہوسناک خوشبو ترغیب دیتی ہوئی للچائی ہوئی فضا میں بکھر رہی تھی۔

کاشی بائی نے ایک عجیب نگاہ سے اپنے ہاتھ میں پچاس ہزار روپے کے نوٹوں کی گڈیوں کو دیکھا۔ ایک لمحے کیلئے انہیں اپنے سینے کے قریب لے آئی۔ پھر بڑی احتیاط سے پل پر چڑھنے لگی۔

کنور بلدیو سنگھ خوب صورت سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک سفید کارنیشن اپنے بٹن ہول میں لگائے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ...

پُل کے درمیان منقش جنگلے کے قریب کھڑے ہو کر کاشی بائی نے ایک سو کا نوٹ ایک گڈی میں سے نکالا اور اُسے نیچے پانی میں ڈال دیا۔

"یہ کیا کرتی ہو۔ ؟"

کنور بلدیو سنگھ نے گھبرا کر کہا۔

جواب میں کاشی بائی نے سو کا دوسرا نوٹ نکالا۔ اور اُسے بھی پانی میں پھینک دیا۔ پھر بڑے سنجیدہ لہجے میں بولی۔

"کنور جی یہ تو میرے نوٹ ہیں۔ میں جو جی چاہے اُن کا کر سکتی ہوں !"

"ارے یہ تو سو سو کے نوٹ ہیں۔ !" کنور بلدیو سنگھ حیرت اور وحشت سے بولا۔

"انہیں پانی میں کیوں پھینکتی ہو۔ باؤری ہوئی ہو"

کاشی بائی نے ہنس کر تیسرا نوٹ نکال کر پانی میں پھینک دیا۔
تینوں نوٹ دھیرے دھیرے پانی میں بہے جا رہے تھے ۔کنول کے پتّوں کی طرح پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ پندرہ بیس قدم آگے نہر پر ایک چھوٹی سی پُلیا تھی ۔جہاں نہر کی ڈھلوان شروع ہوتی تھی ۔ اور جہاں پانی کا دھارا تیز تھا۔
کنور بلدیو سنگھ گھبرا کر پُل سے پلٹا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اُتر کر اپنے خوبصورت سوٹ سمیت پانی میں گھُس گیا ۔ اور نوٹ پکڑنے لگا ۔ کاشی بائی ہنس کر نوٹ پھینکتی جا رہی تھی ۔ اور کنور بلدیو سنگھ گرتا پڑتا نوٹ پکڑ رہا تھا۔
اُس کے سارے کپڑے گیلے اور گندے ہو رہے تھے ۔ بال پریشان اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ اور وہ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔
"کاشی بائی ایسا مت کرو ۔ بھگوان کے لئے ایسا مت کرو ۔"
اور کاشی بائی زور زور سے قہقہے لگا کر نوٹ پھینک رہی تھی۔

رات کو گھر جاکر جب کنور بلدیو سنگھ نے حساب کیا تو معلوم ہُوا کہ صرف پندرہ سو کے نوٹ ضائع ہوئے تھے۔

دوسرے دن کلب کے معزز ممبروں اور کنور بلدیو سنگھ کے مخصوص دوستوں کی زبان پر اِسی واقعے کا چرچا تھا۔ رات کو واپس جاتے ہوئے چند نوکروں نے بھی چھُپ کر یہ واقعہ دیکھ لیا تھا۔ کلب میں ہر طرف اِسی واقعے کے متعلق چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کلب کی بیشتر عورتیں اِس واقعے سے بیحد خوش اور مسرور نظر آتی تھیں۔ کاشی بائی ایسی خوبصورت عورت کی طرف سے اُنہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ ایک خطرناک رقیب کم ہوا۔

بیشتر مرد بھی خوش تھے۔ کنور بلدیو سنگھ نے آج تک کبھی مات نہ کھائی تھی، اور اُن کا پھیکا، پیلا اور کھسیانا چہرہ دیکھ کر مردوں کے دل میں ایک کمینہ مسرّت کی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔

سیٹھ بانگا نے کنور بلدیو سنگھ کو تشفی دیتے ہوئے کہا۔

"صرف پندرہ سو ہی کا تو نقصان ہوا — ! لیکن تم اب تک پچاس ہزار کی جھلک دکھا کر کم سے کم پچیس عورتوں کو تو ہضم کر چکے ہو۔

اب اگر تم پندرہ سو کو پچیس پر تقسیم کرو تو ایک عورت کے حصے میں صرف ساٹھ روپے آتے ہیں۔ حساب کرو تو یہ سودا مہنگا نہیں رہا!"

اور کاشی بائی۔؟

وہ بے وقوف عورت ہر روز کلوک روم کے دروازے پر کھڑی رہتی ہے۔ اور ڈاک کے وقت ہر روز اپنے خاوند کی چٹھی کا انتظار کرتی ہے۔!

ٹچ وڈ!

مس ٹچ وڈ کا اصلی نام گوری سُدھاکر تھا۔ لیکن کلب میں سب لوگ اُسے مِس ٹچ وڈ کہتے تھے۔ کیونکہ گوری کو بات بے بات ٹچ وڈ (Touch wood) کہنے کی عادت تھی۔ ٹچ وڈ کہہ کر وہ فوراً اِدھر اُدھر کسی لکڑی کی تلاش میں دیکھنے لگتیں۔ اور جلدی سے لکڑی کی کسی تپائی یا میز کے کسی لکڑی کے کونے کو ہاتھ لگا دیتیں۔

"ہائے ڈارلنگ کل میں نے نیو فیشن سٹور میں ایک امریکی کو دیکھا۔ وہ میری طرف اس بُری طرح گھورنے لگا گویا مجھے کچا ہی کھا جائیگا۔ ٹچ وڈ"

"تمہیں معلوم ہے مالتی۔ پرسوں سیلنگ کرتے وقت مغرب سے اس زور کی ہوا آئی کہ ہمارا یاٹ تقریباً الٹنے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں ڈوب جاتی ٹچ وُڈ۔۔!"

"رضیہ جاناں! پرسوں میرے پتاجی نے حیدرآباد سے ایک لڑکے کا فوٹو بھیجا شادی کے لئے میری منظوری کے لئے۔ وہ کتنا بھدّا اور بدصورت تھا۔ ہائے اگر اُس سے میری شادی ہوجاتی تو شادی کے پہلے روز ہی میرا ہارٹ فیل ہوجاتا۔ ٹچ وڈ"

"ٹچ وُڈ" سے گوری سدھا کر دہی کام لیتی تھی جو ہم لوگ "بھگوان نہ کرے" یا "توبہ توبہ" سے لیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ توبہ توبہ میں کانوں کو چھونا پڑتا ہے اور ٹچ وُڈ میں کسی لکڑی کو!

گو مس ٹچ وڈ اپنی عمر بہت کم بتاتی تھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب وہ تیس کی عمر کو پار کر چکی تھیں۔ اور ابھی تک غیر شادی شدہ تھیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو ان کا رنگ لکڑی کا سا تھا (ممکن ہے لکڑی کو ہاتھ لگانے سے ایسا ہو گیا ہو)، دوسرے وہ بہت فراخدل تھیں۔ بلکہ نیکدل تھیں۔ اور اکثر اوقات شادی ہونے سے پہلے ہی اپنے منگیتر سے اس قدر گھُل مِل جاتیں کہ منگیتر اُنہیں اوچھے چال چلن کا سمجھکر آخر میں کنّی کاٹ جاتا۔ یہ سچ بات ہے کہ مرد کبھی اُس عورت کو پسند نہیں کرتا جو شادی سے پہلے ہی اُسے حاصل ہو جائے۔ یہ گرُ آج کی ماڈرن سے ماڈرن عورت بھی جانتی ہے۔ وہ ہنسے گی، کھیلے گی، بات بنائیگی، منہ چڑائیگی، سیر کو جائیگی۔ وہ ایک بار قریب آنے کا موقع بھی دیگی مگر عین وقت پر اپنا دامن صاف بچالے جائیگی۔ سمجھدار عورت اپنی عشوہ طرازیوں کی ایک جھلک دکھا کر "باقی آئندہ" کہکر شادی تک کے لئے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتی ہے۔ اِس اعتبار سے سمجھدار عورت ایک مسلسل ناول ہے جو قسط وار شادی کے بعد بھی چلتا ہے۔ غیر سمجھدار عورت ایک افسانہ ہے جو پہلی محفل میں ہی ختم ہو جاتا ہے!

مس ٹچ وُڈ نہ ناول تھی نہ افسانہ۔ وہ ایک کروڑپتی باپ کی لڑکی تھی۔ جو پیدائشی سادہ لوح واقع ہوئی تھی۔ اس اعتبار سے کہ ہر مرد پر اعتبار کر لیتی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ اُس کے ذہن میں مرد مرد نہ تھا۔ ایک پیارا سا گڈّا تھا جس سے وہ کھیلنا چاہتی تھی۔ مصیبت یہ بھی ہوتی کہ ماں باپ کے بیحد لاڈ سے اُس کا جسم اپنی خواہشات کے ساتھ بڑا تو ہو گیا۔ لیکن اُسکا ذہن وہی گڑیا کھیلنے والی لڑکی

کی طرح چھوٹا اور محدود رہا۔ اور جب جسم بڑا ہو جائے اور ذہن چھوٹا رہے تو بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ اس حالت میں مرد کمینہ ہو جاتا ہے۔ عورت فراخ دل ہو جاتی ہے۔!!

کئی بار مس بچ وُڈ کی شادی "لگائی" گئی۔ کیونکہ اُس کی شادی کہیں نہ کہیں لگائی ہی جا سکتی تھی۔ وہ خود کچھ نہ کر سکتی تھی۔ مس بچ وُڈ کو مرد اسقدر پسند تھے کہ وہ تقریباً ہر مرد سے شادی کرنے پر رضامند تھی۔ مرد اُسے ایسے خوبصورت کھلونے نظر آتے تھے، کہ وہ انہیں ہر دم اپنے سینے سے لگائے رکھنے کی تمنا کرتی تھی۔ اسی لئے تو بیچاری کی اب تک کہیں شادی نہ ہو سکی۔ تین بار اُس کی شادی کی بات چیت پکی ہو گئی۔ ایک بار سیٹھ بانگا کے لڑکے مدن لعل سے دوسری بار رائے بہادر جیون داس کے لڑکے شام داس سے۔ تیسری بار خود رائے بہادر جیون داس سے۔ مگر تینوں بار مس بچ وُڈ اپنی حماقت سے اپنا مرد اپنی شادی سے پہلے ہی کھو بیٹھی۔ اُس کے بعد دو تین جگہ جہاں بات لگی ٹوٹ گئی۔ اور ہولے ہولے مس بچ وڈ کی جوانی ڈھلنے لگی۔ اور اُنکے چہرے کا رنگ جو پہلے تازہ شیشم کی لکڑی کا تھا اب پُرانے آم کی لکڑی کی طرح نظر آنے لگا۔ اور کلب کی بہت سی عورتوں کو یقین ہونے لگا کہ چند سال کے بعد مس بچ وڈ کا شمار بھی کلب کی مستقل کنواریوں میں ہو جائیگا۔

اگر اِس دوران میں مس بچ وُڈ کی ملاقات رگھو نندن شرما سے نہ ہوئی ہوتی تو ممکن ہے یہی ہوتا۔

رگھو نندن شرما اولڈ بائٹ کلب کا نیا نیا ممبر ہوا تھا۔ بمبئی میں پہلی بار آیا تھا۔ اور اپنے باپ کے دس لاکھ روپے لیکر اُس نے کارپوریشن کے لئے ایک ہسپتال کی بلڈنگ کا ٹھیکہ لیا تھا۔ جس میں اُسے گذشتہ چھ ماہ سے گھاٹا

پڑ رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ اُس کا باپ بیحد سخت مزاج ہے۔ وہ مزید ایک پائی نہ دیگا۔ اب اُسے بمبئی میں ایک فنانسر کی تلاش تھی۔ اسی لئے وہ اولڈ یاٹ کلب کا ممبر بن گیا تھا۔

رگھو نندن شرما چھوٹے قد کا چھوٹی آنکھوں والا، چھوٹی مونچھوں والا، چھوٹی پچکی ہوئی ٹھوڑی والا نوجوان تھا۔ وہ اپنی خامیوں کو تیز تیز چلنے اور تیز تیز باتیں کر کے پوری کرتا تھا۔ اُسکی آواز بیٹھی ہوئی اور خراش دار تھی۔ اور جب وہ قہقہہ لگاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ساگوان کی لکڑی میں آرہ چل رہا ہے۔ ملٹری اسٹائیل میں چلنے کی خاطر وہ ہر وقت اپنی بغل میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈنڈا بھی رکھتا تھا۔

رگھو نندن شرما اولڈ یاٹ کلب میں بڑی فیاضی سے روپیہ خرچ کرتا تھا۔ تاکہ ممبروں پر اُسکی دُھاک بیٹھ جائے۔ اور کوئی فنانسر سنجیدگی سے اُسکی طرف متوجہ ہو۔ اسی دوران میں اُس نے ایک روز اپنے آپکو یورین کلب میں مدعو کرا لیا اور یہیں پر اُسکی ملاقات پہلی بار گوری سدھاکر سے ہوئی۔

جب پرنس فیروز نے گوری سُدھاکر سے اُسکا تعارف کرایا تو رگھو نندن شرما نے اپنے لکڑی کے ڈنڈے کو دائیں بغل سے نکال کر بائیں بغل میں رکھا اور پھر دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی!"

اور پھر وہی خوشی اُسے کملا بائی بھاونگر، مسٹر مدن لعل بانگا، رضیہ عطاء اللہ اور دوسرے قریب میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے مل کر ہوئی۔ کلب میں ہر شخص اسی طرح ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتا ہے۔ اس مہذب دنیا میں آج تک کبھی کسی کو کسی سے مل کر نفرت نہیں ہوتی۔ ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ ایسے فرشتہ سیرت لوگ رہتے ہیں کلب میں!

اس کے بعد وہسکی کا دور چلنے لگا اور رگھونندن شرما نے گوری سدھاکر سے جو اتفاق سے اُسکے ساتھ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پوچھا "آپ کیا پئیں گی؟ پورٹ یا شیمپین ؟ یا کوئی اور چیز ؟"

"میں تو پورٹ پیئوں گی ؟"

"دیکھئے !" رگھونندن شرما نے گوری سدھاکر کو مشورہ دیا "اگر آپ میری بات مانیں تو پورٹ نہ پئیں ۔ اس وقت ! پورٹ پینے سے عورت کی رنگت خراب ہوجاتی ہے ۔ اور شیمپین سے رنگت نکھر آتی ہے ۔ اسی لئے مغرب میں شوقین مزاج عورتیں شیمپین سے نہاتی ہیں ۔ میرے خیال میں آپ بھی شیمپین لیجئے ۔ آپ کی خوبصورت رنگت شیمپین کے استعمال سے اور بھی نکھر جائیگی ۔ ٹچ وڈ ۔ !"

جب رگھونندن شرما نے ٹچ وڈ کہا ۔ تو گوری سدھاکر کے منہ سے بھی بے اختیار ٹچ وڈ نکل گیا ۔ اور دونوں کے ہاتھ ایک دم لکڑی کی میز سے ٹکرا گئے ۔ اور اُن کے قریب بیٹھے دوسرے لوگ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے ۔

رگھونندن شرما پریشان ہوکر دیکھنے لگا ۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی ۔

پرنس فیروز نے تشریح کی "آج تو غضب کا اتفاق ہوگیا مسٹر شرما اتفاق سے ہماری گوری سدھاکر بھی بات بات میں ٹچ وڈ کہتی ہیں ۔ اور اپنی اسی عادت کی وجہ سے کلب میں مس ٹچ وڈ کہلاتی ہیں ۔ اب کیا معلوم تھا کہ آپ کو بھی یہ عادت ہوگی "

رگھونندن شرما کو جب یہ بات سمجھ میں آگئی ۔ تو وہ بھی زور سے ہنسکر کہنے لگا ۔ "اجی صاحب ! مجھے تو یہ ایسی عادت ہے کہ میں ہر وقت لکڑی کا یہ ڈنڈا اپنی بغل میں رکھتا ہوں ۔ تاکہ اگر کہیں ٹچ وڈ کہکر فوراً کوئی لکڑی ہاتھ لگانے کو

نہ ملے تو اِسی ڈنڈے سے کام چلا لیا جائے "
" بہت خوب ۔ بہت خوب !" سیٹھ بانگا مسکرا کر بولے اور اس طرح عجیب نظروں سے رگھو نندن شرما اور گوری سدھاکر کو دیکھنے لگے کہ گوری سدھاکر نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ اور پھر وہ دزدیدہ نگاہوں سے عجیب میٹھی اداؤں سے رگھو نندن شرما کو دیکھنے لگی۔
اب کے مس بچ وڈ کے ماں باپ نے گوری سدھاکر ڈھیل نہیں دی ۔ اور جلدی جلدی سب معاملہ طے کر دیا۔ اور رگھو نندن شرما نے بھی اس لئے منظور کر لیا کہ اگر اُسے یہ کروڑپتی سُسر نہ ملتا تو گھاٹے کی وجہ سے ہسپتال کا ٹھیکہ بھی اُسکے ہاتھ سے جاتا۔ اور باپ الگ جائیداد سے عاق کر دیتا ۔لہٰذا اُس نے بھی شادی کے لئے فوراً ہاں کر دی ۔ اور ہاں ہوتے ہی فوراً شادی کر دی گئی ۔ اور رگھو نندن شرما اور گوری سدھاکر میاں بیوی بینکر کلب میں مسٹر اینڈ مسز بچ وُڈ کہلانے لگے ۔ کیونکہ دونوں کو ایک ہی مرض تھا۔ اپنے کروڑپتی سُسر کے رسُوخ سے وہ فوراً ہی بورین کلب کا بھی ممبر بنا لیا گیا۔
شادی کے ایک ہفتے کے بعد ہی رگھو نندن شرما کو اپنے بُڈھے باپ کی علالت کے سلسلہ میں کانپور جانا پڑا۔ اُس کا بُڈھا باپ اس غیر متوقع شادی میں شریک نہ ہوا تھا۔ اس لئے بھی رگھو نندن شرما کان پور جا رہا تھا کہ اپنے باپ کو اچھی طرح سے سمجھا سکے کہ اس نے کتنی اچھی جگہ شادی کی ہے ۔ گوری بھی ساتھ جانا چاہتی تھی ۔ مگر رگھو نندن شرما نے منع کر دیا۔ " پہلے میں پتا جی کو منا لوں۔ پھر تُم چلنا۔ اب کی بار صرف مجھے جانے دو۔ بڈھے کو رام کرنے دو۔ کہیں وہی نہ ہو بڈھا بدک جائے اور ہم دونوں کو گھر سے نکال دے۔ بچ وڈ "
" بچ وڈ۔!" گوری چونک کر بولی ۔ پھر بڑی ادا اور پیار سے اُس کی گردن

میں اپنی باہنیں ڈال کر بولی۔
"مگر ڈارلنگ جلدی آجانا۔ مجھ سے اب تمہارے بغیر ایک دن بھی جیا نہ جائے گا۔ !"

رگھونندن شرما دس دن کے اندر لوٹ آیا۔ اُس کا باپ اُس کی شادی سے بہت خوش تھا۔ اور اُس نے اُس کے کاروبار کے لئے مزید دس لاکھ روپے منظور کر دیئے تھے۔ اور رگھونندن سے کہا تھا کہ وہ دیوالی کے موقع پر بہو کو لے کر ضرور کانپور آئے۔ اور رگھونندن نے خوشی خوشی وعدہ بھی کر لیا۔ !
مگر کلب میں آتے ہی اُس نے ایک عجیب و غریب واردات سُنی اور اُسے سُنتے ہی وہ بھونچکا سا رہ گیا۔

رات کو اُس نے گوری سے پوچھا۔
"کیا یہ سچ ہے کہ میری غیر حاضری میں اینوئیل بال کے موقع پر رائے بہادر جیون داس نے تمہارا مُنہ چوم لیا تھا"
"مگر سب کے سامنے تو نہیں چوما تھا"
گوری گھبرا کر بولی۔

"میں اُس کے سنگ ناچ رہی تھی۔ ناچتے ناچتے ہم دونوں ذرا برآمدے میں ہوا کھانے چلے گئے۔ کیونکہ اندر بہت جمگھٹا تھا۔ اور بہت گرمی تھی۔ وہاں برآمدے میں اُس نے مجھے اکیلے دیکھ کر یکایک مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ کہنے لگا "میں نے بہت غلطی کی جو تم سے بیاہ نہیں کیا۔؟"

"بدمعاش۔!"

رگھو نندن غصّے میں چلّایا۔

"سؤر"

گوری نے حامی بھری۔!

"مگر تمہیں کچھ تو خیال کرنا چاہیئے تھا۔ کلب میں ملازم بھی ہوتے ہیں۔ آتے جاتے لوگ دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر یہ کتنی بُری بات ہے کہ اِدھر میں گیا۔ اُدھر تم نے جیون داس کے سنگ.....!"

"اب مجھے کیا معلوم تھا۔؟"

گوری روہانسی ہو کر بولی۔

"ایسی عمدہ تو باتیں کر رہا تھا وہ۔ ایسی عزّت سے مجھے ڈانس کے لئے اُس نے کہا۔ کہ میں تو اُس کے دل کی بات بھی نہ سمجھ سکی۔!"

"میری غیر حاضری میں تمہیں ڈانس میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

"میں تو نہ جاتی مگر رضیہ مجھے زبردستی گھسیٹ کر لے گئی۔ مجھے تو تمہاری یاد ستا رہی تھی۔ مگر رضیہ کہنے لگی بال میں چلے گی تو تیرا من بہل جائے گا۔ اِسی لئے میں چلی گئی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا؟"

گوری تقریباً روہانسی ہوگئی۔
رگھو نندن نے وِہسکی کا ایک گھونٹ اپنے گلے سے اُتارا اور بولا۔
"پھر میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ تو پٹو کی پارٹی میں اُس کے گھر بھی گئی تھی۔ اور جب سب لوگ چلے آئے۔ اُس وقت بھی تو وہیں بیٹھی رہی اور ساری رات وہیں رہی۔!"
"نہیں یہ بالکل جھوٹ ہے"
گوری آبدیدہ ہو کر بولی۔
"میں تو جاتی نہیں تھی۔ مگر کملا بائی مجھے لے گئی۔ اور پٹو نے بھی بہت اصرار کیا۔ اس لئے میں اپنا دل بہلانے کے لئے وہاں چلی گئی۔ اور دو بجے وہاں سے چلی آئی"
"دو بجے تک وہاں کیوں رہی ؟"
"اب کیا بتاؤں ڈارلنگ۔ پٹو کی سالگرہ تھی اور سب لوگ باری باری کھسکتے جارہے تھے۔ اور پٹو مجھے وہاں سے آنے ہی نہ دیتا تھا۔ کہتا تھا۔ میں رات کے دو بجے پیدا ہُوا تھا۔ دو بجے تک یہ پارٹی ضرور چلے گی۔ چاہے سب چلے جائیں۔ مگر میں تجھے نہ جانے دوں گا"
"بدمعاش۔!"
رگھو نندن چلّایا۔
"ضرور"
گوری نے زور سے حامی بھری۔

"مگر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی " رگھونندن نے غصّہ سے کہا۔

"میں صرف دس دن کے لئے باہر گیا تھا۔ کیا تو دس دن کیلئے میرا انتظار نہ کر سکتی تھی۔ ؟"

"میں تو تیرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اور تیرے انتظار میں تیری تصویر کو اپنے گلے سے لگائے، اپنے بیڈ روم میں لیٹی تھی۔ مگر مجھے کملا بائی زبردستی اُٹھا کر لے گئی۔ اور وہاں پہنچ کر پنٹو نے آنے نہ دیا۔ سب لوگ چلے گئے مگر اُس نے مجھے نہ آنے دیا۔"

"پھر کیا ہوا۔ ؟"

"جب سب لوگ چلے گئے اور میں بھی اُٹھنے لگی۔ تو اُس نے مجھے روک لیا۔ بولا۔ تم تو مت جاؤ۔ میں نے کہا۔ میں ضرور جاؤنگی۔ مجھے اپنے پتی کی یاد ستا رہی ہے۔ اِس پر وہ بولا۔ اچھا ایک گلاس سائیڈر کا تو پیتی جاؤ۔ میں نے ایک گلاس سائیڈر کا پیا۔ اور تم مجھے بہت یاد آئے "

"پھر۔ ؟"

"پھر میں نے ایک جام شیری کا پیا اور تم مجھے بہت بہت یاد آئے "

"پھر۔ ؟"

"پھر میں نے ایک جام پورٹ کا پیا اور تم مجھے بہت بہت یاد آئے "

"پھر — ؟"

رگھونندن شرما بڑی بے چینی سے بولا۔

"پھر میں نے ایک جام مارٹنی کا پیا۔ اور تمہاری یاد میں میرے حلق سے سسکیاں نکلنے لگیں"

"ہاں۔ ہاں مگر پھر کیا ہوا۔ ؟"

"پھر میں نے ایک گلاس شمپین کا پیا اور تمہاری یاد میں رونے لگی"

"اُس کے بعد — ؟"

"اُس کے بعد پٹو بولا۔ تم روؤ نہیں۔ میں تمہارے لئے ایک عُمدہ کاک ٹیل بناتا ہوں"

"تو اُس کے بعد — ؟"

"اُس کے بعد میں نے وہ کاک ٹیل بھی پی لی"

"پھر — ؟" رگھونندن نے انتہائی غصّے سے بپھر کر پوچھا "آخر پھر کیا ہوا۔ ؟"

"پھر مجھے کچھ یاد نہیں کیا ہوا۔ جب میں ہوش میں آئی تو میں صوفے پر پڑی تھی اور پٹو اپنے صوفے پر سو رہا تھا۔ اور رات کے دو بجے تھے۔ میں جلدی سے وہاں سے بھاگی اور آتے ہی اپنے ڈارلنگ کی تصویر سے لپٹ کر رونے لگی"

یہ کہکر گوری نے اپنا سر رگھونندن کی آغوش میں ڈال دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رگھونندن کو غصّہ تو بہت آیا۔ مگر اُسکے دل میں طرح طرح کے دوسرے خیالات بھی آ رہے تھے۔ اُسکے ذہن میں

اپنے باپ کا چہرہ آیا۔ اُس کا باپ دیوالی پر اپنی بہو کا انتظار کریگا۔ پھر اُس کے دل میں اپنے کروڑپتی سُسر کا چہرہ آیا۔ اور ہزاروں مصلحتیں اُس کے سینے میں لہر در لہر موجزن ہونے لگیں۔

دھیرے دھیرے رگھو نندن سسکیاں لیتی ہوئی گوری کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"وعدہ کرو اب تم میری غیر حاضری میں کہیں نہیں جاؤ گی۔؟"

گوری نے اپنا آنسوؤں سے تر بتر چہرہ اُس کی گود سے اُٹھایا اور بولی۔

"وعدہ کرتی ہوں۔ اب کہیں جاؤں تو مجھے کالا سانپ ڈس لے میں کھڑی کھڑی دھرتی میں سما جاؤں۔۔۔۔"

"ہے ہے۔ کیا کہتی ہو ڈارلنگ ٹچ وڈ۔"

"ٹچ وڈ۔"

مسٹر اینڈ مسز ٹچ وڈ دونوں کی انگلیاں لکڑی کی تپائی پر ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

آؤ مر جائیں!

رجنی کے پاس سب کچھ تھا۔ کولھاپور میں اُس کے شوہر کا ایک بہت بڑا کارخانہ تھا جس میں چھ ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس کارخانے میں نئے ڈیزائن کے زراعتی ہل تیار ہوتے تھے۔ ٹریکٹروں کے کچھ پُرزے بنتے تھے۔ اور اب رجنی کا خاوند شام راؤ کولھاپور میں ڈیزل انجن بنانے کا کارخانہ کھولنے جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ خود رجنی کے باپ کا ایک بہت بڑا کارخانہ بمبئی میں موجود تھا۔ اِس کارخانے میں ٹین کے ڈبے تیار ہوتے تھے۔ ہر روز ساٹھ ہزار ڈبے تیار ہوتے تھے۔ جو پینٹ بنانے والی کمپنیاں اور بناسپتی گھی بیچنے والی کمپنیاں فوراً خرید لیتی تھیں۔ رجنی کے باپ کے مرنے کے بعد یہ کارخانہ بھی رجنی کے قبضہ میں آگیا تھا۔ کیونکہ رجنی اپنے باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس لئے رجنی کے پاس کیا کچھ نہیں تھا۔ کارخانے، گھر، گاڑی اور اب تو اُس کی گود میں تین سال کا ایک بچہ بھی کھیلتا تھا۔ شام راؤ کی پہلی دو بیویوں کے بے اولاد مر جانیکے بعد شام راؤ نے رجنی سے شادی کی تھی اور اب رجنی نے اُسکی صنعتی سلطنت کے لئے ایک ولیعہد بھی مہیا کر دیا تھا۔ شام راؤ بیحد خوش تھا۔ اور یوں تو رجنی بھی ہر طرح سے خوش تھی۔ اُس کے پاس دولت

تھی۔عزت تھی۔اولاد تھی۔خوبصورتی تھی۔وہ تمام چیزیں تھیں۔جن کی تمنا اس دُنیا میں ایک عورت کر سکتی ہے۔مگر رجنی خوش نہیں تھی۔

اُسے شام راؤ سے شدید نفرت تھی گو وہ اُس کا شوہر تھا اور ہندوستانی سماج کے قاعدے اور قانون سے ہر عورت کو اپنے شوہر سے محبت ہوتی ہے، مگر رجنی کو نہیں تھی۔شام راؤ کی عمر پچپن برس کی تھی اور اب شادی کے آٹھ سال کے بعد رجنی تیس کی ہوئی تھی۔پچیس برس کا فرق بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔اتنا بڑا فرق جو پہلی اور تیسری نسل کے سوچنے میں ہوتا ہے، رہنے سہنے، کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں ہوتا ہے۔وہی فرق ان دونوں کے درمیان تھا۔شام راؤ دن میں دو گھنٹے گنپتی پوجن کرتا تھا۔رجنی دن میں دو گھنٹے میک اپ کرتی تھی۔شام راؤ دن میں چار گھنٹے کھانستا تھا۔رجنی دن میں چار گھنٹے ہنستی تھی۔شام راؤ سونے کی گولیاں کھائے بغیر رات کو سو نہیں سکتا تھا۔رجنی نوکرانی کی مدد کے بغیر جاگ نہیں سکتی تھی۔شام راؤ مرہٹی میں بات کرنا پسند کرتا تھا۔اور رجنی انگریزی میں۔شام راؤ گیتا پڑھتا تھا۔رجنی اگاتھا کرسٹی۔شام راؤ ٹھنڈے پانی سے نہاتا تھا۔رجنی گرم پانی سے۔شام راؤ نے آج تک شراب اور گوشت نہ چکھا تھا۔رجنی ان کے بغیر ایک لقمہ نہ کھا سکتی تھی۔شام راؤ کو کلب لائف پسند نہ تھی۔رجنی بوربن کلب، یاٹ کلب، سپورٹس کلب اور سیون کلب کی ممبر تھی۔شام راؤ کو تنہائی پسند تھی۔رجنی کو ہنگامہ۔شام راؤ کو نیلا رنگ پسند تھا۔رجنی کو ہرا۔شام راؤ چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد وہ سورگ میں چلا جائے۔رجنی چاہتی تھی کہ مرنے کے بعد بھی وہ بوربن کلب میں واپس آجائے۔

شام راؤ کو لکشمن سے نفرت تھی!

رجنی لکشمن سے محبت کرتی تھی!
لکشمن کے پاس بھی سب کچھ تھا۔ وہ بھی بمبئی کی سب سے بڑی آئرن فاؤنڈری کا مالک تھا۔ اُس کی سلائی کی مشین کے کارخانے کے مال نے باہر سے آنیوالی سلائی کی شینوں کو ہر میدان میں پیٹ دیا تھا۔ لکشمن شوگر فیکٹری وودربھ کے علاقے کی سب سے بڑی شوگر فیکٹری تھی۔ دولت، عزت، وجاہت، مرتبہ رعب، دبدبہ کیا کچھ لکشمن کے پاس نہیں تھا۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ کیونکہ اُسے بیوی سے سخت نفرت تھی۔ اور اُسے اپنی بیوی سے اتنی ہی سخت نفرت تھی جتنی رجنی کو اپنے شوہر سے تھی۔ ممکن ہے ان دونوں کی باہمی محبت کا باعث یہی نفرت رہی ہو۔
کچھ بھی ہو مگر اب بمبئی کے امیر ترین حلقوں میں لکشمن اور رجنی کا عشق ایک کھُلا سکینڈل بن چکا تھا۔ محبت جو کسی تیسرے کی نفرت سے شروع ہوئی تھی۔ اب ایسی باہمی وارفتگی کی صورت اختیار کر چکی تھی کہ کلب میں اکثر لکشمن اور رجنی اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ دونوں گھروں میں خانگی ناچاقی ایک خطرناک صورت اختیار کر چکی تھی۔ ادھر لکشمن کی بیوی شانتی نے اپنے شوہر کو طلاق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اُدھر شام راؤ کسی حالت میں اپنی بیوی کو الگ کرنے پر تیار نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انکار سے محبت کا اصرار اور شدید ہو گیا۔ محبت کا جذبہ پانی کی روانی کی طرح ہے اسے راستہ دیدو تو سماج کے کھیتوں میں جذب ہو جاتا ہے اور بچوں کی فصل پیدا کرنے کے کام آتا ہے۔ راستہ نہ دو اور بند ھ باندھ دو تو پانی کی طرح اکٹھا ہو کر اُمڈتا ہے اور بجلی پیدا کرتا ہے۔ یہ بجلی جو کبھی تو محبت کرنیوالوں کے گھر کو روشن کر دیتی ہے اور کبھی انہیں جلا کر خاک کر دیتی ہے۔

مگر محبت کرنے والے اپنے انجام کی فکر کب کرتے ہیں۔ رجنی اور لکشمن سماج کے بندھن سے ٹکرا کر ایک دوسرے کے اور قریب آگئے اور کلب میں اور دیگر اعلیٰ پیمانے کی مجلسی محفلوں میں بھی اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ محبت کی تیز برقی رو اُن کے دلوں میں اس شدت سے گردش کر رہی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونا چاہتے تھے۔ مگر حالات کی مجبوری تھی جو انہیں رات کے بارہ بجے جب کلب کے دروازے بند ہونے لگتے ایک دوسرے سے جدا ہونے پر مجبور کر دیتی۔ لکشمن کو اپنے گھر جانا پڑتا اور آہیں بھرتی ہوئی رجنی اپنے خاوند کے گھر چلی جاتی۔

"گھر بھی ہے، گاڑی بھی ہے، عزت بھی ہے دولت بھی ہے۔ مگر تم میرے شوہر نہیں ہو تو کیا مزا ہے۔ اس دنیا میں ؟" رجنی جھنجھلا کر لکشمن سے کہتی۔

اور لکشمن اپنے سینے کی آگ کو دباتے ہوئے جھلسے ہوئے لہجے میں شدید بیقراری سے کہتا "اگر میں تمہیں اپنی دھرم پتنی نہ بنا سکا رجنی تو میں مرجاؤں گا۔ بھگوان کی قسم میں مر جاؤں گا۔"

"آؤ مر جائیں" رجنی شدتِ غم سے سسکتے ہوئے بولی "اس زندگی کا فائدہ بھی کیا ہے ؟ چار سال مجھے ہو گئے اپنے شوہر سے طلاق مانگتے ہوئے، چار سال تمہیں ہو گئے اپنی بیوی سے علیحدگی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، نتیجہ صفر ہے۔ بتاؤ ایسی زندگی سے کیا حاصل ۔ ؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو" لکشمن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں بھی اس زندگی سے بیزار آ چکا ہوں۔ آؤ مر جائیں"

"مگر مرینگے کیسے ؟" رجنی نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

لکشمن کے ماتھے پر سوچ کی گہری لکیریں نمودار ہو گئیں۔ اُس نے سوچ سوچ کر

کہا: "ہم لوگ بیئر پی کر مرجائیں گے"۔
"باؤلے ہوئے ہو ہے! بھلا بیئر پی کر بھی کوئی مرا ہے۔؟"
"کیوں نہیں؟ میں ایک درجن بیئر کی بوتلوں کا آرڈر دیئے دیتا ہوں۔ باہر چل کر سمندر کے کنارے بیٹھ کر بیئر پیتے ہیں اور اُس وقت تک پیتے رہینگے جب تک جان نہ نکل جائے"——
"ایک درجن بیئر سے کیا ہوگا۔ تین چار بوتلیں تو میں دن بھر میں اکیلے پی جاتی ہوں"۔ رجنی نے مشکوک لہجے میں کہا۔
"بیئر سے نہیں مرینگے تو وہسکی منگالیں گے۔ برانڈی منگالیں گے اور اُس وقت تک شراب پیتے رہیں گے جب تک ہم دونوں کا کلیجہ نہ پھٹ جائے"۔
رجنی کو بات جچ گئی۔ اب تک جتنے محبت کرنیوالے تھے۔ وہ یا تو زہر پی کر مرے تھے۔ یا گولی مار کر مرے تھے۔ یا انھوں نے اپنے گلے میں پھانسی کی ڈوری ڈالی تھی۔ یا وہ آگ میں کود کر مرے تھے یا سمندر میں ڈوب کر مر گئے تھے۔ مگر شراب پی کر آج تک کوئی محبت کرنیوالا جوڑا نہ مرا تھا۔ اِس لئے رجنی کو یہ ترکیب بہت پسند آئی۔ اِس میں جدّت تھی۔ ندرت تھی، سلیقہ تھا۔ رجنی دل ہی دل میں اخبار کی سرخیاں سوچنے لگی "محبت کرنیوالوں کی انوکھی موت!"۔ "ایک دلگداز سپنا جو موت کی باہوں میں پُورا ہوا"۔ "شمعِ عشق کے پروانے رجنی اور لکشمن!"۔ ہم دونوں کی تصویریں اکٹھی اخبار میں چھپیں گی۔
رجنی نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا: "ڈارلنگ میری آنکھوں کا میسکرا تو نہیں پھیل گیا ہے۔؟"
"نہیں!"
"اور رخساروں کی سُرخی۔؟"

"نہیں۔!"
"اور لپ سٹک۔؟"
"نہیں سب ٹھیک ہے۔!"
"تو چلو شروع کریں مرنا!" رجنی نے بڑے اطمینان سے کہا۔
وہ دونوں یاٹ کلب میں بیٹھے تھے۔ اُن دونوں نے سمندر کے کنارے ایک کونے کا بڑا سن شیڈ انتخاب کیا۔ اُسکے نیچے کرسیاں بچھواکر انھوں نے موٹے ہولے پی پی کر مرنا شروع کر دیا۔ اُنکے دل میں سچی محبت تھی۔ چہرے پر راسخ عزم کی سُرخی تھی۔ اور ہاتھ میں چھلکتا ہوا جام تھا۔ سامنے بے کنار سمندر لہریں لے رہا تھا۔
"محبت کی خاطر!" لکشمن نے پہلا جام اُٹھا کر کہا۔!
"پیار کی موت کے لئے!!" رجنی اپنا جام لکشمن کے جام سے ٹکراتے ہوئے بولی۔
ساری صبح وہ پیتے رہے۔ پھر اُنھوں نے ڈٹ کر لنچ کھایا۔ چکن کریم سُوپ اور فرنچ چینز میں دم دیکر تیار کی ہوئی پام فریٹا اور پشاوری بّرہ اور کلیجا اور آدھا میٹھا۔ اور آدھا تُرش نوڈل سلاد اور چینی کوفتے اور بھُنا ہوا مُرغ اور آخر میں خیری کریم کے ساتھ انگریزی پیچ کے قتلے۔ بیحد عمدہ لنچ تھا۔ مزا آ گیا۔ ٹھیک ہے۔ آدمی مرے بھی تو ڈھب سے، عزت سے اور شان سے۔ یہ دوسرے لوگ بھی کیا کرتے ہیں۔ فاقے سے بیکاری سے مر جاتے ہیں۔ بیماری سے مر جاتے ہیں اور اگر کچھ نہ ہو سکا تو گاڑی کے نیچے سر دے کر مر جاتے ہیں۔ چھی! چھچھورے، کمینے!!
لنچ کے بعد وہ دونوں پھر مرنے میں مصروف ہو گئے۔ سمندر کے کنارے سن شیڈ کے نیچے جاکر آرام کرسیوں پر لیٹ گئے۔ صبح تک اُن دونوں نے ایک درجن بوتلیں بیئر کی ختم کر ڈالی تھیں۔ اور اب اُنکے سارے جسم میں ایک نیم گرم گنگنا سا سرور لہریں لے رہا تھا۔ دھوپ عمدہ تھی اور آنکھیں غنودگی سے لبریز!

"دوسرا دور شروع کرنے سے پہلے ذرا سا آرام نہ کرلیں؟" لکشمن نے مشورہ دیا۔
"ایک ہلکا سا siesta!"
"ہاں ٹھیک ہے Just a little nap" رجنی بولی۔ اور پھر آنکھیں بند کرتے ہی اونگھنے لگی۔

پیلے، ہرے، اودے، اور گلابی سن شیڈ کے نیچے آرام کرسیوں میں دو محبت کرنیوالوں کے جسم دراز تھے۔ سمندر کے پانیوں میں دھوپ ایک ہلکے سے نشے کی طرح گھلی ہوئی تھی اور ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں موت کی مدھم لوری تھی۔ "ایسے میں مرنا کتنا خوبصورت ہے۔" لکشمن نے آنکھیں بند کرتے کرتے سوچا۔

وہ دونوں پوری دوپہر سوتے رہے۔ اس دوران میں شام راؤ آیا اور اپنی بیوی کو سوتے دیکھ کر چپکے سے کھسک گیا۔ لکشمن کی بیوی آئی اور اپنے خاوند پر ایک بیزاری کی نگاہ ڈال کر رخصت ہوگئی! مؤدب بیرے مچھلیوں کی طرح بے آواز سبک خرام میز کے ارد گرد گھوم کر نظریں ڈالکر خاموشی سے رخصت ہوتے رہے۔ شام کے پانچ بجے کے قریب اُن دونوں کی آنکھ کھُلی تو رجنی اور لکشمن نے اپنے اپنے کلوک روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ رجنی نے ساڑھی بدلی، میک اپ بدلا۔ بالوں میں پھول لگائے۔ لکشمن نے جوتے بدلے، موزہ بدلا، سوٹ بدلا، ٹائی بدلی اور بالوں میں کنگھی کی اور خوشبو لگائی۔ پھر دونوں آمنے سامنے اُس سن شیڈ کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور وہسکی پینے لگے۔ اور snacks کھانے لگے۔ چکن چاپ تکے، روسٹ تیتر، شاشلک اور فش فنگرز۔ رات کا کھانا انھوں نے گول کر دیا۔ اور وہسکی کے جام پر جام پیتے رہے۔ سنہری وہسکی خوبصورت سمندر اور نشہ افروز موسیقی! رات کے ساڑھے دس بجے تک دو بوتلیں ختم ہو چکی تھیں۔
"کیا تم۔۔۔ تم۔۔۔ مجھے۔۔۔ دیکھ سکتی ہو؟" لکشمن نے لکنت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں تم دونوں کو دیکھ سکتی ہوں؟" رجنی تقریباً ہکلاتے ہوئے بولی۔
"دوسرا کون ہے؟" لکشمن نے پوچھا۔
"ایک تم ہو۔ دوسرا۔ ؟۔ دوسرے بھی تم ہو۔!"
لکشمن شراب میں ڈوبی ہوئی ہنسی ہنسنے لگا۔
"کیوں ہنستے ہو؟" رجنی نے پوچھا!
"مجھے تم تین نظر آ رہی ہو۔ تین رجنیاں ۔۔ ایک دو تین۔ لکشمن باری باری اپنے ہاتھ کی انگلیاں اُٹھاتے ہوئے بولا اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اسکی ایک ایک اُنگلی پر ایک ایک من کا بوجھ ہے!
یکایک اُسکا ہاتھ وہسکی کی دوسری خالی بوتل سے ٹکرایا۔ بوتل زمین پر جاگری۔ اور اُسکا مُنہ ٹوٹ گیا۔ وہسکی کی بوتل اب فرش پر ایک خوبصورت زخمی عورت کی طرح پڑی تھی!
"تیسری بوتل لاؤ!" لکشمن بے چینی سے بولا۔
بارہ بجے کے قریب تیسری بوتل بھی ختم ہو گئی۔ لکشمن نے کہا: "مجھے اب تم نظر نہیں آتیں۔ میری ۔ میری آنکھوں کے آگے وہ ناچ رہی ہیں"
"وہ کیا۔؟"
"وہ۔۔۔۔!"
"وہ کیا۔؟" رجنی نے پوچھا۔
"وہ جن کے پر ہوتے ہیں" لکشمن نے سوچ سوچ کر کہا۔
"پریاں۔؟"
"نہیں۔ وہ جن کے پَر ہوتے ہیں"
"فرشتے ۔ ؟"

"نہیں! وہ جن کے پر ہوتے ہیں۔ پر! پر!! پر!!! سُنتی نہیں ہو"
لکشمن کو غصہ آنے لگا تھا: "وہ جن کے پر ہوتے ہیں!"

"تتلیاں۔؟"

"ہاں! ہاں! ہاں!" لکشمن خوش ہو کر بولا "میرے آگے پیچھے اوپر نیچے
تتلیاں ناچ رہی ہیں۔!"

"مجھے ایسا لگتا ہے" رجنی بولی "جیسے تم کانچ کے بنے ہوئے ہو! میں تمہیں
آرپار دیکھ سکتی ہوں"

"میرا خیال ہے کہ ہم مر رہے ہیں!" لکشمن نے مکمل طمانیت سے کہا۔

"میرا بھی خیال یہی ہے!" رجنی بولی "مگر بوتل ختم ہو چکی ہے"

"تو چوتھی بوتل منگاؤ!" لکشمن زور سے چلایا "بیرا.... بیرا!!"

"حضور!" ایک بیرا دوڑتا ہوا حاضر ہو گیا۔

"اولڈ ڈاگ کی ایک اور بوتل لاؤ!"

"حضور بارہ بج گئے ہیں۔ بار بند ہو گیا ہے"

"کیسے بند ہو سکتا ہے؟ ابھی تو ہم مرے بھی نہیں!" لکشمن غصے سے بولا۔

"وٹ نان سنس" رجنی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی "فوراً بوتل لاؤ ہمیں
آج ہی مرنا ہے"

بیرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر کچھ سمجھنے سمجھانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ شرابیوں
سے شب و روز اُس کا واسطہ پڑتا تھا۔ اس لئے وہ انتہائی لجاجت مگر کامل
مضبوطی سے بولا "حضور میں آپ کے دشمن! مگر میں کیا کروں۔ بار تو اب
بند ہو چکی ہے"

"بند ہو چکی ہے؟ ایں!" لکشمن ہچکی لیکر بولا "تو ہمیں ہماری گاڑی تک پہنچا دو"

"مگر ڈارلنگ" رجنی نے تقریباً غمیں ہوتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو مرنا تھا!"
"آج جتنا مر سکتے تھے مر چکے۔ باقی کل مریں گے!" لکشمن نے ایک شاہانہ لاپرواہی سے بازو ہلاتے ہوئے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اور اس کوشش میں وہ کرسی سے نیچے گر پڑا۔
"ہائے مر گیا۔ میرا ڈارلنگ!" رجنی شرابی لہجے میں چیخ کر بولی۔ اور فوراً بے ہوش ہو گئی۔

وہ دونوں تو نہیں مرے۔ لیکن اس واقعے کے دو روز بعد شام راؤ دل کی حرکت بند ہونے سے چل بسا۔ اور اس واقعے کے کوئی چھ ماہ بعد لکشمن کی بیوی ڈبل نمونیہ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اور اس طرح سے سماج کی وہ دیواریں جو اُن دونوں کے درمیان حائل تھیں۔ اتفاق سے یا حادثے سے یا قدرت کے کرشمے سے چھ ماہ ہی میں دور ہو گئیں۔ اب وہ بندھ ٹوٹ چکا تھا جس نے اُنکے جذبے کو کامرانی کی منزل تک پہنچنے سے روک رکھا تھا۔ اور کلب میں لوگ ہر روز اُن کی شادی کی خبر سننے کے لئے بیتاب ہونے لگے
وہ دونوں بھی کوئی کم بیتاب نہیں تھے۔ مگر دُنیا کو بھی تو مُنہ دکھانا ہے اور اسی سماج میں رہنا بھی تو ہے۔ لہٰذا سوگ کی پوری مدّت انھوں نے ایک دوسرے سے ملے یا بات چیت کئے بغیر گزار دی۔ وہ دونوں کبھی کبھی کلب ضرور آتے تھے۔ اور ایک دوسرے سے ملتے بھی تھے۔ مگر صرف ہیلو کہہ کر ایک دوسرے سے کترا جاتے تھے۔ وہ دونوں دُنیا کو یقین دلانا چاہتے تھے

کہ وہ اِس قدر جلد باز اور چھچھورے نہیں تھے جتنا دنیا اُنہیں سمجھتی تھی۔ پھر اُن دونوں کے بچے بھی تھے۔ اُنہیں بھی ذہنی طور پر تیار کرنا تھا۔ اور اس تمام کام میں کافی وقت لگتا ہے۔ مگر سچی محبت ہو تو یہ وقت بھی کٹ جاتا ہے۔ چنانچہ چھ ماہ اور اسی طرح خاموشی سے گزار دیئے گئے۔!

آخر ایک روز رجنی نے لکشمن کو اپنے گھر پر مدعو کیا۔

"وہاں پر بس صرف میں اور تم ہوں گے؟" رجنی نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"اور سب باتیں طے کر لیں گے نہ" لکشمن نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"ہاں" رجنی اس طرح شرما کر کمزور آواز میں بولی جیسے زندگی میں پہلی بار اُسکی شادی کی بات چیت چھیڑی جا رہی ہو۔

مقررہ وقت پر لکشمن، رجنی کے گھر پہنچ گیا۔ رجنی بڑی خندہ پیشانی سے اُسے ملی۔ مگر لکشمن کو یہ دیکھ کر ذرا سی حیرت ہوئی کہ وہ اُسے ڈرائنگ روم میں لے جانے کی بجائے اپنے باپ کے نجی آفس میں لے گئی!

"یہ کیوں۔؟" لکشمن پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

رجنی نے آہستہ سے لیکن مضبوط لہجے میں کہا۔ "کچھ باتیں ایسی ہیں جو شادی سے پہلے ہم دونوں میں طے ہو جائیں تو اچھا ہے۔"

رجنی اپنے باپ کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میز کے سامنے لکشمن بیٹھ گیا اور نہایت محظوظ ہو کر رجنی کی طرف دیکھنے لگا۔ اور میز کو اپنی اُنگلیوں سے کھٹکھٹاتے ہوئے بولا۔ "کہو! Fire on!"

"یہ تو تمہیں معلوم ہے!" رجنی جھجکتے جھجکتے بولی۔ "کہ میرے خاوند کے مرنے کے بعد سارا بوجھ مجھ پر آن پڑا ہے۔ میرے باپ کے مرنے کے بعد

ڈمبو فیکٹری کی ساری ذمہ داری مجھ پر آپڑی ہے۔ اب اُن کے مرنے کے
بعد دوسرے کارخانوں اور فیکٹریوں کا کام بھی مجھے دیکھنا پڑیگا۔"

"یہ عورت کا کام نہیں ہے!" لکشمن نے قدرے تفکر سے کہا۔" وہ سب میں
کرلوں گا۔ تمہیں فکر کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیوں ضرورت نہیں ہے؟" رجنی قدرے حیرت سے بولی!۔ "ڈبہ فیکٹری کا
سارا حساب کتاب تو میرے ہاتھ میں رہا ہے۔ میں نے کبھی اپنے خاوند کو ادھر
ہاتھ تک لگانے نہیں دیا ہے! جو کام میں گذشتہ آٹھ سال سے کرتی آئی ہوں! وہ
اب کیسے نہیں کرسکتی۔؟"

"ساری!" لکشمن نے رجنی کے لہجے کی مضبوطی اور کسی قدر تلخی سے متاثر
ہوکر کہا۔ "تم نے مجھے غلط سمجھا۔ میرا مقصد تمہاری مدد کرنا تھا۔ تمہارے کام میں
دخل دینا نہیں تھا۔ بطور ایک شوہر کے میرا یہ فرض ہے۔ لیکن اگر تم اسے ناپسند
کرتی ہو تو مجھے تمہارے روزمرّہ کے حساب کتاب میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔
میں OVER ALL نگرانی کرلیا کروں گا۔"

"جی نہیں!"۔ رجنی جلدی سے بولی! "over all نگرانی ہی تو میں
کرتی ہوں۔ ورنہ روزمرّہ کا کام تو جنرل منیجر کے ہاتھ میں ہے اور یہ نگرانی میں
صرف اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہوں۔ یہ مت بھولو کہ میرا ایک بچہ بھی ہے
اُس کے مستقبل کا بھی مجھے خیال کرنا چاہیئے۔"

"of course, of course" لکشمن سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور اپنے خاوند کے کارخانوں کا حساب کتاب میں اپنے ہاتھ میں رکھونگی
ظاہر ہے کہ میں تجربے اور مشورے سے گاہے گاہے فائدہ اُٹھاؤں گی مگر۔
سارا کاروبار میرے ہاتھ میں رہے گا۔ چیک بک، بینک بیلنس، ملکیت،

ان تمام باتوں میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہوگا۔ ویسے میں تمہاری ہوں۔ تم سے دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ مگر ڈارلنگ مجھے یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ میرا ایک بچہ بھی ہے، جو اپنے باپ کے مرنے سے یتیم ہوگیا ہے۔"

"پور ڈارلنگ! لکشمن افسوس بھرے لہجے میں بولا۔ مجھے اس بچے کا تم سے زیادہ خیال ہے۔ اس لئے میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ میں تمہارے کاروبار کو دیکھ لیا کروں گا۔ میں اس پر مُصر نہیں ہوں۔ نہ مجھے اس سے ایک پائی فائدہ اُٹھانے کی خواہش ہے۔ مگر تمہارے مستقبل، تمہارے بچے کے مستقبل کے تحفظ کی خاطر میں نے یوں سوچا تھا کہ جب ہماری شادی ہو رہی ہے، جب ہمارے دل ملے ہیں تو ہمارے کاروبار کیوں آپس میں مل جائیں! اور اس کام کیلئے میں ایک پلان چند ماہ سے سوچ رہا تھا۔ اور آج اُسے لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ بلاشبہ اُس پلان پر آج عمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن شادی کے بعد —— اگر تم چاہو تو!

"وہ پلان کیا ہے؟ رجنی نے پوچھا۔

لکشمن نے کہا: "بہتر تو یہی ہوتا کہ دونوں کاروبار ایک دوسرے میں ضم کر دیئے جاتے۔ اور تمہاری اور میری —— ہم دونوں کی باہمی ملکیت میں آجاتے اور چیک بُک اور دیگر کاغذات پر ہم دونوں کے دستخط ہوتے۔ مگر تمہیں یہ تجویز پسند نہیں ہے۔"

"ڈارلنگ میرا ایک بچہ ہے، مت بھولو!" رجنی ذرا زور سے بولی۔

"میرے بھی چار بچے ہیں" لکشمن نے ذرا تلخی سے جواب دیا۔ کمرے میں چند لمحوں کے لئے مکمل سکوت رہا۔ رجنی سر جھکائے

میز پر جھک گئی۔ لکشمن نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر یہ سکیم تمہیں پسند نہیں تو جانے دو۔ میں اصرار نہ کروں گا۔ لیکن میری تمہاری محبت کے اشتراک سے ایک نیا کارخانہ ضرور معرض وجود میں آنا چاہیئے۔"

"میں ایک نئے بچے کا سوچ رہی تھی۔!"۔ رجنی نے آہستہ سے کہا۔

"وہ بھی ہو جائے گا۔ مگر وہ اِس قدر اہم نہیں ہے جتنی میری یہ نئی سکیم۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارے ڈبہ بنانے والے کارخانے میں ڈرم اور ڈبے بنانے بند کر دیئے جائیں اور......"

"ڈبے بنانے بند کر دیئے جائیں؟" رجنی حیرت سے چلا کر بولی۔

"ہاں ڈبے بنانے بند کر دیئے جائیں۔ آج کل بناسپتی گھی اور پینٹ والوں کو ڈبے بیچنے میں اتنا فائدہ نہیں جتنا ایلومینیم کے سوٹ کیس بنانے میں ہے۔"

"ایلومونیم کا سوٹ کیس؟ باؤلے ہوئے ہو" رجنی نے چیخ کر کہا۔

"بہترین سکیم ہے۔ آج کل تمام ہوائی جہاز کمپنیاں اور ہوائی جہاز پر سفر کرنے والے مسافر ایلومینیم کے سوٹ کیس استعمال کرتے ہیں! کیونکہ یہ وزن میں بہت ہلکے ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر تمہارے کارخانے کو میری آئرن فاؤنڈری سے ملا دیا جائے اور ٹین کے ڈبوں کی بجائے ایلومینیم کا سوٹ کیس......!"

"ایلومینیم کا سوٹ کیس؟ مائی فوٹ!" رجنی گرج کر بولی "میرے کارخانے میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو۔"

لکشمن بولا "تمہارے بھلے کے لئے کہہ رہا ہوں۔ ایک سوٹ کیس پر سات روپے منافع ملتا ہے۔ اور ٹین کے ایک ڈبے پر کیا ملتا ہے؟ تین پیسے! معاف کرنا تمہارے شوہر کو ہم لوگ کارخانہ دار کم اور کباڑیا زیادہ سمجھتے تھے"

"میرا خاوند کباڑیا تھا تو تم لوہار ہو! آئرن فاؤنڈری! تمہاری آئرن فاؤنڈری کی بیلنس شیٹ کیا کہتی ہے؟ پچھلے سال تمہیں کتنا فائدہ ہوا۔؟"

"ساڑھے تین لاکھ"

لکشمن بولا۔

رجنی بولی "میرے ٹین کے ڈبوں کے کارخانے نے پچھلے سال ساڑھے چار لاکھ کمائے ہیں"

"یوں تو میری سلائی کی مشینوں کے کارخانے سترہ لاکھ کمائے ہیں!"

لکشمن نے چڑھ کر کہا۔

"تو میرے کولھاپور کے کارخانے نے بیس لاکھ کمائے ہیں جناب!"

رجنی شیخی سے بولی۔

"آپ کے مرحوم باپ اور مرحوم شوہر دونوں کے کاروبار میں جتنا سرمایہ لگا ہوا ہے۔ اُس سے دُگنا سرمایہ میری اکیلی شوگر فیکٹری میں لگا ہوا ہے"

لکشمن نے جواب دیا۔

"اجی دیکھی ہے آپ کی شوگر فیکٹری! کھانڈ کے کاروبار میں تو

سلمپ چل رہا ہے آج کل ۔ اس مندے میں کون پوچھتا ہے آپ کی شوگر فیکٹری کو ۔ میرا ڈیزل کارخانہ دیکھئے ۔ اکیلے مغربی جرمنی سے ڈیزل انجنوں کے لئے بارہ لاکھ روپے کے آرڈر آچکے ہیں ۔ اور آپ چاہتے ہیں کہ میں سارا کاروبار ٹھپ کر کے ایلومینیم کے سوٹ کیس بناؤں ۔ ؟ میرا خیال تھا کہ آپ مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں ! کیسا خیال تھا میرا ۔ ؟" ایلومینیم کے سوٹ کیس ۔ ؟ کوئی شخص بھی جو مجھ سے محبت کرتا ہے کس طرح سے مجھے ایلومونیم کے سوٹ کیس بنانے کا مشورہ دے سکتا ہے ؟ جب تک کہ اس کے دل میں بے ایمانی نہ ہو ؟ ۔ چوری اور دھوکے کا خیال نہ ہو ۔ میرے اور میرے بچے کے مستقبل کو تباہ کر دینے کا ارادہ نہ ہو ! ایلومینیم کے سوٹ کیس ؟ ؟ خوب !"

"تو تمہارا خیال ہے میں بے ایمان ہوں ؟ چور ہوں ؟ ؟ دھوکے باز ہوں ۔ ؟ ؟ ؟"

لکشمن نے سر سے پاؤں تک غصے سے کانپتے ہوئے کہا ۔ اور اسی غیض و غضب کے عالم میں وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا ۔

"اپنے الفاظ واپس لو"

"نہیں لیتی"

رجنی نے بھی اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ۔

"بلکہ اب تو میں تمہاری باتوں کو اچھی طرح سے سمجھ کر یہ کہتی ہوں کہ تمہاری محبت محض ایک ڈھکوسلہ تھی ۔ تم نہ صرف یہ کہ چور اور بے ایمان ہو ۔ بلکہ کروک اور فراڈ بھی ہو"

"اور میں کہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو نہایت ہی کمینی، چھچھوری اور احمق عورت ثابت کر رہی ہو۔ اب تو مجھے یہ سوچ سوچ کر بھی حیرت ہو رہی ہے کہ میں کیسے اُس عورت سے عشق کر بیٹھا جس کی کمپنی محض ٹین کے ڈبے بناتی ہے!"

"ایلومینیم کے سوٹ کیس؟ مائی فٹ!"

"شٹ اپ!"

"گیٹ آؤٹ!"

رجنی اپنے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا کر بولی۔

لکشمن نے چند لمحوں کیلئے رجنی کو گھور کر دیکھا۔ پھر اس نے تیزی سے اپنا فیلٹ ہیٹ اُٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اُس دن کے بعد اُن دونوں میں کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ کلب میں اگر ایک دوسرے کا سامنا بھی ہو جاتا ہے تو بالکل اجنبیوں کی طرح ملتے ہیں اور ہیلو کہے بغیر منہ پھیر کر چپ چاپ گزر جاتے ہیں۔

چاچا مہرو

جس دن چاچا مہرو نے قاسم کو مس رضیہ عطاء اللہ سے ہنستے بولتے دیکھ لیا اُسی دن اُسے کچن میں بُلا کر زور سے ڈانٹ دیا۔

چاچا مہرو کلب کا سب سے پُرانا ملازم تھا۔ اس بڑھاپے میں بھی اس کا رنگ پالش کئے ہوئے تانبے کی طرح چمکتا تھا۔ اب تو اُسکے شانے خمیدہ ہو چکے تھے لیکن جوانی میں اُس کا چھفٹ کا سیدھا پُورا قد بیحد شاندار رہا ہوگا۔ اس عمر میں بھی چاچا مہرو اپنی مونچھوں کو بل دیکر رکھتا تھا۔ گو اب اِن مونچھوں کا ہر بال سفید تھا۔ مگر ان مونچھوں کا رکھ رکھاؤ اب بھی کہے دیتا تھا کہ رسی جل گئی بل نہیں گیا۔ چاچا مہرو مسلم راجپوت تھے۔ پُرانی وضع کی راجپوت پگڑی باندھتے تھے۔ کبھی کبھی کلب کے سب سے پُرانے ممبروں کو وہسکی پلا دیتے تھے۔ ورنہ درحقیقت اب وہ کلب کی عملی زندگی سے ریٹائر ہو چکے تھے اور اُنکے وقت کا زیادہ حصّہ اب دوسرے ملازموں کی دیکھ بھال اور ڈانٹ ڈپٹ میں گزرتا تھا۔ چاچا مہرو بڑے بڑے انگریز گورنروں، پُرانے مہاراجاؤں اور نوابوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اس لئے کلب کے عام ممبروں کو اُن سے آنکھیں ملانے میں بھی ڈر محسوس ہوتا تھا۔ اگر بھولے سے کسی ممبر کو سلام بھی کر دیں تو وہ ممبر

دِن بھر مسرّت محسوس کرتا تھا۔ جیسے اُسے ایک دن کی بادشاہت مل گئی ہو۔

"تم اپنے آپ کو کیا یوسف سمجھتے ہو۔" چاچا مہرو نے کلب کے وسیع کچن کے ایک کونے میں حقہ گڑگڑاتے ہوئے قاسم سے پوچھا۔ قاسم اُن کے سامنے ایک مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

"آخر میں نے کونسا گناہ کیا ہے۔" قاسم نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ مگر اسکی حیرانی بالکل بناوٹی تھی۔ کیونکہ قاسم جانتا تھا۔ کہ چاچا مہرو جانتا ہے کہ قاسم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے۔ قاسم مہرو کا بیٹا تھا اور وہ کونسا بیٹا ہے جو اپنے باپ کی نگاہ نہیں پہچانتا۔؟

"میں جانتا ہوں" چاچا مہرو نے حقے کی نے چھوڑ کر سنجیدہ رو ہو کر کہا۔
"بیٹا کبھی میں بھی تمہاری طرح جوان تھا۔!"

قاسم کو دیکھ کر واقعی یہ سمجھ میں آجاتا تھا۔ کہ چاچا مہرو کی جوانی کس قدر خطرناک اور پُرآشوب رہی ہوگی۔ کس قدر رِند اور نشہ آور رہی ہوگی۔ کس قدر تیز اور مہلک ثابت ہوئی ہوگی۔ اُن عورتوں کیلئے جو اُس زمانے میں کلب کی ممبر رہی ہوں گی۔

کیونکہ قاسم کو آج کل وہی مسئلہ درپیش تھا جو کبھی مہرو کو اپنی جوانی میں رہا ہوگا۔
قاسم گو کلب کا بیرہ تھا۔ اور نیا نیا بیرہ ہوا تھا لیکن اسکے دلکش اور خوبصورت شباب نے اور اُس کے وجیہہ مردانہ اوصاف نے بہت سی عورتوں کے دلوں میں کھلبلی سی دوڑا دی تھی۔ اکثر عورتوں کی دبی خواہش یہ ہوتی تھی کہ کلب میں قاسم ہی اُن کی سروس کرے۔ گو کوئی عورت کھلے طریقے پر اسکا اعتراف کرنے کیلئے تیار نہ تھی۔ کچھ عورتیں تو اپنے آپ سے بھی اس کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ مگر یہ خواہش اکثر عورتوں کے دل کے

کسی خانے میں موجود رہتی تھی۔ اور قاسم کے آتے ہی نگاہ کے کسی نشانے سے ظاہر ہو جاتی تھی۔

"قاسم میرا پیگ بناؤ۔"

"قاسم میرا سگریٹ سُلگاؤ!!"

"قاسم میرا پرس اُٹھا دو۔"

پیگ تھماتے ہوئے، سگریٹ سلگاتے ہوئے، پرس اُٹھا کر دیتے ہوئے جب قاسم کی انگلیوں سے اُن کی اُنگلیاں چھو جاتیں۔ تو دیر تک قاسم کے مضبوط ہاتھوں کا لمس اُن کی نازک جلد پر لرزتا رہتا۔ اور احساس میں ایک طویل بوسے کی طرح گھُلتا رہتا۔ ماچس سُلگاتے وقت قاسم کا چہرہ، قاسم کے ہاتھ، قاسم کی سانس اس قدر قریب ہو جاتے تھے کہ فرطِ مسرت سے آنکھیں بند ہونے لگتی تھیں۔ اور دل میں کوئی لطیف جذبہ سگریٹ کی طرح سلگنے لگتا تھا۔ کتنے وسیع اور بڑے شانے تھے قاسم کے۔ جی چاہتا تھا کہ اُسکے سینے پر سر رکھ کر آرام اور خوشی سے رو لیا جائے۔ کیونکہ عورت صرف آنسوؤں ہی سے اپنے جذبے کا اقرار کر سکتی ہے۔ وہ خوش ہوتی ہے تو روتی ہے۔ غم کرتی ہے تو روتی ہے۔ باپ مر جائے تو روتی ہے۔ شوہر بچ جائے تو روتی ہے۔ ایک دن کا فاقہ ہو تو روتی ہے۔ دس ہزار کا زیور مل جائے تو روتی ہے۔ وہ ایک ہیرین پر رو سکتی ہے۔ اور ایک تخت کو ٹھکرا سکتی ہے مگر اپنے آپ پر کبھی ہنس نہیں سکتی۔ کیونکہ اپنے آپ پر ہنسنے کیلئے اپنی خامیوں کے وجود پر ایمان لانا ضروری ہے۔ مگر یہ کون کر سکتی ہے۔ کیا آج تک کسی پھول نے اپنی خامی کا اقرار کیا ہے۔؟ کسی شفق نے اپنی بے ثباتی پر اصرار کیا ہے۔؟ کسی رنگ کسی لہر کسی نغمے کسی روشنی نے اپنے وجود کی مکملیت سے انکار کیا ہے۔؟ عورت کو اپنی خامیاں معلوم

نہیں اس لئے وہ روتی ہے۔ مرد کو اپنی اتنی خامیاں معلوم ہیں کہ بغیر ہنسنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔

کلب کے مرد عورتوں پر دل ہی دل میں ہنستے تھے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ قاسم پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور اُن سے بھی زیادہ کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور اُن سے بھی زیادہ کڑی نگاہ قاسم کا باپ خود رکھ رہا تھا۔ اِسی لئے وہ آج کل قاسم کو سب نوکروں کے سامنے بلا کر ڈانٹ رہا تھا۔

"میں دیکھتا ہوں تم آج کل رضیہ مس صاحب کی خدمت میں زیادہ رہتے ہو" چاچا مہرو نے شکایتاً اپنے بیٹے سے کہا "میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ وہ تمہیں اُس وقت اپنے پاس بلاتی ہیں جب وہ اپنی ٹیبل پر اکیلی بیٹھی ہوتی ہیں۔ یا جب لوگ لنچ پر چلے جاتے ہیں۔ یا یاٹ کلب میں سیلنگ کو جاتے ہیں یا اندر ناچ کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہ اُس وقت تمہیں اپنے پاس بلا لیتی ہیں۔ اِس وقت تم کیا کر رہے تھے اُنکے پاس۔ ؟"

"وہ ..... اون کا گولہ" قاسم بولا۔

"اُن کا اون کا گولہ زمین پر گر گیا تھا۔ اور الجھ گیا تھا۔ مجھے بلا کر انھوں نے کہا یہ گولا اُٹھا دو۔ جب میں گولا اُٹھانے لگا تو بولیں۔ یہیں زمین پر بیٹھ کر اُسے سُلجھا دو۔ تو میں وہیں اُن کی کُرسی کے قریب نیچے غالیچے پر بیٹھ کر اون کے پیچیدا رلچھوں کو سُلجھانے لگا۔"

"عورت کا دل بھی اُون کے گولے کی طرح ہے۔ قاسم!" چاچا مہرو اُسے سمجھاتے ہوئے بولے "اُس کی گتھیاں سُلجھاتے ہوئے بڑی دیر لگتی ہے۔ مگر تم ہنس کیوں رہے تھے۔ ؟"

"رضیہ مِس صاحب کہہ رہی تھیں!" قاسم نے کہا "کہ جس

کے لئے میں یہ سویٹر تیار کر رہی ہوں اگر اُسے یہ سویٹر پسند نہ آیا تو میں یہ سویٹر تمہیں بخش دوں گی۔ اس پر میں نے کہا خدا کرے مِس صاحب یہ سویٹر اُسے پسند نہ آئے۔"

"اِس پر وہ ہنسنے لگیں۔ تو پھر میں بھی ہنسنے لگا۔"

"ایک نوکر کو اپنے مالک کے ساتھ ہنسنے بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔" مہرو اُسے سمجھانے لگا۔

"مگر وہ لوگ خود میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ کبھی کوئی میرا ہاتھ ذرا سا دبا دیتی ہے۔ کبھی کوئی ٹیبل کی آڑ میں میری ٹانگ پر چٹکی لے لیتی ہے۔ رز ملا میم صاحب نے تو مجھے ایک دفعہ آنکھ ہی مار دی......"

"تم کسی بات کا نوٹس مت لو۔" مہرو نے گرج کر کہا۔

کچن کے باورچی نے ایک بڑے چمچے کے ہینڈل سے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب قاسم کو اتنا بھی مت ڈانٹو مہرو چاچا! آخر کس کا بیٹا ہے۔ ؟"

سُنا ہے۔ چاچا مہرو کی جوانی قیامت کی تھی۔ کئی جلیل القدر انگریز عورتوں۔ رانیوں۔ سیٹھانیوں اور بیگمات کا وہ منظورِ نظر رہ چکا تھا۔ کئی بڑے بڑے خاندانوں میں امیدوں کے چراغ اُس کے رحم وکرم سے روشن ہوئے تھے۔ کئی محلوں کے نورِ نظر اُس کی نظرِ عنایت کا نتیجہ تھے۔ مگر شاباش ہے چاچا مہرو کو۔ آج تک اُس بھلے آدمی نے کسی کا راز افشا نہ کیا۔ اپنی کسی حرکت سے کسی کمزوری سے ناجائز

فائیدہ نہیں اُٹھایا۔ اُس نے کبھی محبت کو محبت نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اُسے ایک خدمت سمجھکر انجام دیا۔ جیسے وہ کلب میں کسی کو وہسکی پلا رہا ہو۔ یا کِسی کو بھُنے ہوئے تیتر کی قاب پیش کر رہا ہو۔ اسی طرح وہ نہایت خاموش اور مؤدب انداز میں محبت کرتا تھا۔ اور محبت کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس طرح وہاں سے ہٹا دیتا تھا جس طرح بیر کی خالی بوتلوں کو میز سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک مکمّل خدمت گذار تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک مالک اور ایک نوکر کے درمیان عشق ایک فریضہ جسم کا ہو سکتا ہے۔ جذبہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ کبھی چاچا مہرو نے اس جذبہ کو اپنانے اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اسی وجہ سے چاچا مہرو کی زندگی ہندوستان کے بڑے کلبوں میں اتنے آرام سے اور عزت سے کٹی تھی۔ اسی لئے آج وہ اپنے بیٹے قاسم پر اس قدر گرم تھا۔ کیونکہ اُسے قاسم کی بے باک نگاہیں اور اُس کا بے تکلف انداز گفتگو بالکل پسند نہ تھا۔ ان چیزوں کو مرد تو بالکل پسند نہیں کرتے اور عورتیں بھی صرف اُسی وقت تک پسند کرتی ہیں۔ جب تک اُن کی خواہش کی تکمیل نہ ہو جائے۔ لہٰذا بے وقوف کیوں بنا جائے اور اپنی نوکری کیوں خطرے میں ڈالی جائے۔

ایک شفیق باپ کی طرح چاچا مہرو نے قاسم کو بہت سمجھایا بجھایا۔ مثالوں کی صورت میں چند رازہائے درونِ پردہ بھی افشا کئے۔ پُرانے تجربوں کو کرید کرید کر حقیقت کی نشان دہی بھی کی۔ قاسم اپنے باپ کے سامنے گردن جھُکائے ہونٹ چباتے ہوئے سب کچھ سُنتا رہا۔ اور نہ جانے کب تک اُسے یہ لکچر سُننا پڑتا۔ مگر عین اُس موقع پر کاشی بائی

کچن کے دروازے پر آکر رُکی۔ اور قاسم کی طرف دیکھ کر بولی۔
"پامیلا مس صاحب تم کو بُلاتا ہے"
قاسم فوراً وہاں سے بھاگ لیا۔

جو لوگ جانتے ہیں وہ تو یہی کہتے ہیں کہ اس موقع کے ڈیڑھ ماہ بعد مس خورشید بھاجی والا اپنے لکھپتی باپ کی سیف سے چالیس ہزار روپے چُرا کر قاسم کو لے کر بھاگ گئی۔ مگر پولیس یہ کہتی ہے کہ قاسم نے لڑکی کو اغوا کیا جاننے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ اس موقع کے وقت مس خورشید کی عمر تیئیس سال کی تھی۔ مگر بعد میں پولیس نے ڈاکٹروں کی شہادت سے اس امر کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا کہ لڑکی نا بالغ تھی۔ اور زبردستی اغوا کی گئی تھی۔ مقدمہ چلا اور قاسم کو پانچ سال کی سزا ہوئی۔
چاچا مہرو نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کی لاکھ لاکھ کوشش کی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ انھوں نے مسز بھاجی والا کو وہ زمانہ یاد دلایا جب وہ اُن کے خدمت گزار تھے۔ مگر زمانہ گزری ہوئی خدمتوں اور بیتی ہوئی باتوں کو کہاں یاد رکھتا ہے۔ خصوصاً جب اُن کا کوئی تحریری ثبوت نہ ہو۔ نتیجے میں قاسم جیل چلا گیا۔ اور چاچا مہرو بستر سے لگ گئے۔ یہ صدمہ اتنا بڑا تھا اور چاچا مہرو کی

سمجھ میں کسی طرح یہ بات نہ آتی تھی کہ کس طرح وہ لوگ جن کے گھر
اُنھوں نے آباد کئے تھے۔ اُسکے گھر کو برباد کرنے پر تُل گئے۔ جن کی
خاطر اُس نے ساری زندگی جھوٹ کی قبا اوڑھے رکھی اُن کے لئے
ایک سچ بولنے کو تیار نہ تھے۔

چاچا مہرو اس صدمے سے ایسے بستر سے لگے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے۔ کلب
والوں نے اپنے دیرینہ خدمت گزار اور ملازم کو بچانے کیلئے ہر ممکن سعی
کی۔ نوکر خانے میں دو کمرے اُن کے لئے خالی کرا دیئے۔ شہر کے بہترین
ڈاکٹروں سے اُن کا علاج کرایا۔ اُن کے بستر کے قریب ہر وقت کلب
کے بوڑھے ممبروں اور ادھیڑ عمر کی عورتوں کا تانتا سا لگا رہتا تھا۔ ایک
شریف خدمتگذار مر رہا تھا۔ اتنا کاری زخم کھانے کے باوجود اُس
نے سی تک نہ کی۔ اُس کے ہونٹوں سے کسی کے لیے کلمۂ شکایت نہ نکلا کسی
کا راز اُسکے ہونٹوں تک نہ آیا۔ ایسے شریف، باوفا، خاموش طبیعت خدمتگذار
آج کل چوپایوں میں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ انسانوں میں کہاں ہوگا؟

دس ماہ کی شدید علالت کے بعد چاچا مہرو کلب کے نوکر خانے میں مر گیا
اور اپنے سینے میں ایسے ایسے راز لئے مر گیا۔ جن کے افشا ہو جانے پر
کئی خاندانوں کی تقدیریں بدل جاتیں۔ اور اُس کے مر جانے پر افسوس کے
ساتھ ساتھ لوگوں کو ایک گونہ خوشی بھی نصیب ہوئی اور کئی سہمے ہوئے
سینوں میں اطمینان کا سانس آزادی سے چلنے لگا۔ اور کئی مرد پہلی بار
اپنی اولاد کو محبّت اور لطف کی نظروں سے دیکھنے لگے اور شفقت کا وہ
شدید جذبہ محسوس کرنے لگے۔ جس سے وہ آج تک محض چاچا مہرو کے زندہ

ہونے کی وجہ سے محروم تھے۔

اور اُن عورتوں نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ جن کے لطف وکرم کا سزاوار مرحوم مہرو تھا۔ وہ خاموش باوضع راجپوت اپنی آنکھیں بند کئے بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ جب وہ عورتیں اپنے شوہر اور اپنی اولاد لیکر اُس کے بستر کے سامنے سے آنسو پوچھتے ہوئے گزری تھیں۔ اُن محسوسات کے بارے میں کوئی کیا بتا سکتا ہے۔ جو زر و دولت کی بے شمار ریشمی ڈوریوں سے بندھے ہوں۔ ایسے کسی جذبے کی بیلنس شیٹ کسی طرح بھی کسی کارخانے کی بیلنس شیٹ سے الگ نہیں ہو سکتی۔

مگر اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہی لوگ جنہوں نے اُسکے بیٹے کو جیل پہنچایا تھا۔ اب اُسکی میت کے سامنے عزت اور احترام سے جھکے ہوئے تھے۔ کیونکہ مرنیوالا خدمت گزار تھا اور جیل جانیوالا عاشق۔ ایک نے خدمت کی تھی۔ دوسرے نے بغاوت!۔ اور وہ لوگ جو ہم سے دور کہیں اوپر رہتے ہیں۔ نہ عشق پسند کرتے ہیں نہ بغاوت۔ صرف خدمت پسند کرتے ہیں۔

وہ لوگ اُسے بڑی عزت سے، شان وشوکت سے دفنانے لے گئے۔ اور چاچا مہرو کے اعزاز میں بورن کلب آدھے دن کے لئے بند کر دیا گیا۔ تو اس پر کلب کے بہت سے ایسے ممبروں کو حیرت ہوئی جو نئی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اور جو یہ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کہ آخر ایک معمولی نوکر کے مرجانے پر کلب آدھے دن کے لئے بھی کیوں بند کیا جائے۔؟

جب نوجوانوں کی مخالفت کے باوجود کثرتِ رائے سے کلب کو آدھے دن کے لئے بند کر دینے کا فیصلہ کر دیا۔ سیٹھ بانگا کے بیٹے مدن لعل بانگا نے احتجاج کرتے ہوئے بڑے زور سے چلا کر کہا۔

"جب بڑے بڑے ممبروں کے مرنے پر کلب کو بند نہیں کیا گیا۔ تو ایک معمولی نوکر کے مرنے پر کلب کو کیوں بند کیا جا رہا ہے؟ آخر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ چاچا مہرو کون تھا۔؟"

"تیرا باپ!" پروفیسر ملکانی کے جی میں آیا کہ وہ صاف بات سیٹھ بانگا کے بیٹے کو بتا دے۔ مگر پھر اس نے سوچا۔ اس کا کیا فائیدہ؟۔ کون اُس کی بات کا یقین کرے گا۔ اور کسے اس کی پرواہ ہوگی۔؟ کیونکہ ایک امیر آدمی کا اصل شجرۂ نسب اُس کے باپ سے نہیں بلکہ اُس کی پاس بُک سے ملتا ہے۔!

جولی گیسکاں

"وہ لوگ جولی گیسکاں کی لاش کو لا رہے ہیں۔"

اولڈ یاٹ کلب کے پانٹون کے کنارے کھڑے ہوئے مرد اور عورتوں کے جھمگٹے میں کسی نے کہا۔ اور لوگوں کی نظریں دور سامنے سمندر سے لوٹنے والی دو موٹر کشتیوں پر جم گئیں۔ کنور یاور سنگھ کا چہرہ فق تھا۔ اور اس نے اپنے دل کی بے چینی کو چھپانے کیلئے دوربین اپنی آنکھوں سے لگا رکھی تھی۔ دوربین اور ہاتھ نے اسکے چہرے کو کافی حد تک چھپا رکھا تھا۔ پھر بھی اسکی چھوٹی باریک کتری ہوئی مونچھوں کے نیچے اسکے ہونٹ بار بار کانپ اٹھتے تھے۔ اس کے قریب راج کماری نرملا اپنے سینے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور بیہوش ہو جانیکا ارادہ کرتی تھی۔ اور اسے ملتوی کر دیتی تھی۔ کیونکہ اتنے بڑے جھمگھٹے میں بیہوش ہونے کیلئے جگہ ہی کہاں تھی۔ ؟

پھر کنور یاور سنگھ نے دوربین اپنے چہرے سے ہٹالی۔ راجکماری نرملا کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر کلب کے اندر جانے لگا۔ راجکماری نرملا بھی اپنے بیحد نفیس کٹے ہوئے بالوں کو ہولے ہولے سہلاتی ہوئی اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ دونوں کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

کچھ لوگوں نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ راجکماری نرملا کے

حسن وجمال کا شہرہ دور دور تک تھا۔ ایسی چھوٹی سی پیاری ناک تھی۔ اُسکی کہ سارے بمبئی میں کسی خوش جمال عورت کے پاس نہ ہوگی اور اُس کی شفاف زیتونی رنگت کے نیچے جیسے پگھلی ہوئی دھوپ بہہ رہی تھی۔

مگر اس وقت راجکماری بہت اُداس تھی۔ رہ رہ کر اُسکی پیاری کلائی کی ناک کے باریک سیپی کی طرح نازک نتھنے کسی نامعلوم جذبے سے پھڑک اُٹھتے اور ہیرے کی کیل لرز لرز جاتی۔

یہ سوچ کر کتنی حیرت ہوتی ہے کہ ابھی دو گھنٹے پہلے جولی گیسکاں زندہ تھی۔ وہ اور رکنور یاور سنگھ دونوں پانٹون پر کھڑے کھڑے دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ دھیمے سروں میں اور کسی قدر غصّے کے ساتھ مگر شدید سنجیدگی سے وہ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اور جولی گیسکاں کی چوٹی بار بار کسی لہراتی ہوئی ناگن کی طرح اُسکی پیٹھ اور کولھوں پر لہراتی تھی۔

جولی کلب کی واحد یورپین عورت تھی جسکے بال کٹے ہوئے نہیں تھے۔ اور سب سے لمبے تھے اور سنہرے تھے۔ اور اتنے ملائم کہ دُھنکی ہوئی روشنی سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ جولی کا رنگ بیحد صبیح تھا۔ ہونٹ بھرے ہوئے اور رسیلے۔ اور جب وہ فرانسیسی زبان میں بات کرتی تھی تو اُسکی زبان کی سلاست اُسکی آنکھوں کی گویائی اور ہاتھوں کی مرصع جنبش مل کر ایک ایسا تاثر پیدا کرتی تھیں۔ جس سے بچ نکلنا تقریباً ناممکن تھا.....

اب سے دو گھنٹے قبل کسی کے دل میں یہ خیال آسکتا تھا۔ کہ جولی یوں مر جائے گی۔ چمکتے ہوئے خوشگوار دن میں نازک پھوار کی طرح برستی دھوپ

میں وہ سیاہ و سبز مخملیں جینز اور گلابی بلاؤز میں کھڑی پانٹون پر کنور یاور سنگھ سے بات کر رہی تھی۔ وہ لوگ دیر تک باتیں کرتے رہے تھے۔ اور کلب کے ایک ممبر نے جس سے بالعموم کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ گھڑی دیکھ کر بعد میں بتایا تھا کہ جولی اور یاور دونوں پورے پینتیس منٹ تک پانٹون پر کھڑے باتیں کرتے رہے تھے۔ پھر جولی غصّے میں اپنی چوٹی لہراتی ہوئی کنور یاور سنگھ کا بازو جھٹک کر ایک موٹر لانچ میں بیٹھ کر سمندر میں گھومنے کیلئے چلی گئی تھی۔ اور کنور یاور سنگھ اُسے بلاتا ہی رہ گیا تھا۔

جولی موٹر لانچ کو دور تک سمندر کے پانیوں میں لے گئی مگر کسی وقت بھی اولڈ یاٹ کلب کا کھلا لاؤنج اُسکی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ کشتی کو بہت دُور لیجا کر اُس نے دوربین سے دیکھا۔ تو اُسے اولڈ یاٹ کلب میں سے بہت سے لوگ دوربینیں لگائے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے نظر آئے۔ مگر کنور یاور سنگھ اُسکی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کنور یاور سنگھ کی پیٹھ اُس کی طرف تھی۔ اور اُسکے سامنے راجکماری نرملا بیٹھی تھی۔ اور اُسے دیکھتے ہی دل کے اندر رُکے ہوئے سارے آنسو اُسکی آنکھوں میں اُبل آئے اور وہ ایک چھلانگ لگا کر موٹر بوٹ پر کھڑی ہوگئی اور دور کلب کی طرف ہاتھ ہلا کر پانی میں کود گئی۔ اُسے پانی میں کودتے دیکھ کر بہت سے ممبر چونکے۔ اور دوربینیں چھوڑ کر اپنی کرسیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اِدھر اُدھر بے بسی سے دیکھنے کے بعد پھر دوربین اُٹھا کر دور سمندر کے پانیوں میں دیکھنے لگے۔ جہاں موٹر بوٹ ایک سفید کاغذ کی کشتی کی طرح ڈول رہی تھی۔

وہ چونکا دینے والی کیفیت دم بدم بیتابی میں بڑھتی چلی گئی۔ جب

سیکنڈ اور منٹ وقت کے پہیئے سے اُترتے چلے گئے ۔ اور جولی پانی سے باہر نہ نکلی ۔ گھڑی کی آواز کبھی ایسی صاف اور ہولناک نہ تھی جتنی اس وقت تھی اور اب جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا ۔ وقت کی گھڑی کے ساتھ دل کی گھڑی کی وحشتناک آواز بھی شامل ہوتی جارہی تھی —— چند عورتیں چیخ مار کر بیہوش ہوگئیں ۔ اور سٹیوارڈ چرن سنگھ اسُی وقت دو ملازم لیکر دوسری موٹر لانچ میں جولی کو بچانے کے لئے بھاگا ۔

مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی ۔ اور اب وہ لوگ جوُلی کی لاش کو موٹر بوٹ میں رکھ کر لارہے تھے ۔

قومیت کے بہت سے اصول ہیں ۔ کچھ اچھے ہیں کچھ بُرے بھی ہیں ۔ اُن میں سے ایک اصوُل یہ بھی ہے کہ باہر کے لوگوں پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ۔ ایک اصول یہ بھی ہے کہ باہر کی عورتیں کبھی باوفا نہیں ہوتیں ۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم باہر سے آنے والی ہوا کی مہک کیوں سونگھتے ہیں اور باہر سے آنیوالی بدلیوں کو اپنے وطن میں کیوں برسنے دیتے ہیں ۔ ؟

جولی ایک ایسی ہی بدلی تھی ۔ رس اور جوانی اور برس کر سیراب کردینے کی تمنا سے بھری ہوئی ۔ جو چندر نگر میں اپنے شوہر کے ساتھ وارد ہوئی تھی ۔ موسیو گیسکاں ایک ضروری کام سے پیرس سے چندر نگر بھیجے گئے تھے ۔ چھ ماہ کے عرصے ہی میں اُنھوں نے اپنے کام کو حسن خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ۔ اسُ سے متاثر ہو کر پیرس نے اُن کی خدمات مستقل طور پر ہندوستان میں منتقل

کر دیں۔ دو سال چندنگر میں رہنے کے بعد وہ بمبئی بھیجدیئے گئے۔ جہاں چار سال کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد چند سال جولی کے لئے اور نہ صرف جولی کے لئے بلکہ اُسکے چاہنے والوں کے لئے بھی بڑے پُر اسرار سال ہیں۔ جولی یکایک بمبئی سے لاپتہ ہوگئی۔ وہ اپنے وطن فرانس واپس نہیں گئی۔ مگر یورپین کلب یا اولڈیاٹ کلب یا اسی طرح کے کسی عمدہ کلب میں وہ نہیں دیکھی گئی۔ اِدھر اُدھر کی افواہیں سُننے میں آجاتی ہیں۔ کہ وہ یہیں پر کہیں ہے۔

مگر کہاں ہے کسی کو پتہ نہ چلتا تھا۔ پھر کسی نے بتایا کہ جولی نے کسی اینگلو انڈین سے شادی کرلی ہے۔ جو ریلوے میں انجن ڈرائیور ہے۔ اور جو اُسے شراب پی کر پیٹتا ہے۔ مگر کسی کو اس قسم کی افواہوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر سُنا گیا کہ وہ اینگلو انڈین انجن ڈرائیور دراصل اینگلو انڈین نہ تھا۔ آدھا ہندوستانی آدھا فرانسیسی یہودی تھا۔ ملازمت ختم ہوتے ہی جولی کو چھوڑ کر برازیل چلا گیا۔ پھر اُس کا کیا ہوا۔؟ جولی کا کیا ہوا۔؟ ان باتوں پر مزید غور کرنے کی ضرورت اب کسے ہے۔؟ یورپین کلب میں لوگوں کی دلچسپی اُسی وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک آدمی حالات کے سطح آب پر سر نکالے تیرتا رہے۔ بلکہ اگر ہو سکے تو موٹر لانچ میں گھومتا ہے۔ جو لوگ غریبی کی سطح کے نیچے ڈوب جاتے ہیں۔ مچھلیوں کی طرح فرائی کرنے کے کام ہی آتے ہیں۔

اس لئے کلبوں میں لوگ بھول گئے۔ اور گھروں میں لوگ بھول گئے۔ اور پکنکوں میں بھول گئے اور ڈانس پارٹیوں میں لوگ بھول گئے کہ جولی گیسکاں ایسی من موہنی مورت بھی بمبئی میں کبھی موجود تھی۔ نئی نئی صورتیں نت نئے عشوے اور ادائیں لیکر دلوں کو برمانے لگیں۔ اور لوگ جولی گیسکاں

کو بھول گئے۔

پھر یکایک ایک روز جولی گیسکان کلب میں وارد ہوئی۔ اکیلی تنہا کسی ساتھی کے بغیر۔ مگر بیحد خطرناک جولی سنبھلی ہوئی۔ گہری، نازک اندام، خوش جمال، مگر بیحد سنجیدہ اور خطرناک ہر نگاہ طرح دیتی ہوئی۔ ہر جنبش کتراتی ہوئی۔ ہر نگاہ سازش کرتی ہوئی۔ اب وہ کھُلے دل کی فرانسیسی عورت نہ رہی تھی۔ ایک خطرناک ہندوستانی عورت بن گئی تھی۔

اتنے سال وہ کہاں رہی۔؟ اُس نے بتایا کہ وہ الموڑے کے آگے چلی گئی تھی۔ اور سادھوؤں کے ایک مٹھ میں شامل ہو گئی تھی۔ وہ یوگا سیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ پُرانہ فلسفہ جس سے تڑپتی ہوئی روحوں کو سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس سے پہلے جولی پیرس کے نائٹ کلب سے لیکر پیرس کے نئے فیشن تک بات کر سکتی تھی۔ اب وہ یوگ، فلسفہ، نروان سیکھ کر اور بھی خطرناک ہو گئی تھی۔ اب مردوں کیلئے یہ بالکل ناممکن تھا کہ وہ اپنی عورتوں کی سرزنش کے باوجود جولی سے دور رہ سکیں۔!

مگر جولی اب وہ پہلی سی جولی نہ رہی تھی۔ بدلی برس کر تھم گئی تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر ہواؤں میں اُڑنا چاہتی تھی۔ اُسکی نگاہیں۔ کلب کے کہستانی سلسلے میں برف کی ایک چوٹی کی تلاش میں تھیں۔ صرف ایک آغوش ایک سہارا۔ ایک ساتھی جسے وہ اپنا سب کچھ دیدے اور اُس سے سب کچھ لے لے۔ اب وہ پہلے کی طرح ہر کسی پر بھروسہ کرنیوالی عورت نہ رہی تھی۔ جسے نہ ماضی کی فکر ہو نہ مستقبل کی۔ اب اسکی ساری نسائی جبلتیں مکمل طور پر بیدار تھیں۔ اب وہ کبھی غلطی نہ کریگی۔

جولی کے اس نئے دور میں جتنے لوگ اُسکے قدموں میں گرے تھے اُن میں سے اُس نے کنور رایا در سنگھ کو چُن لیا تھا۔ ریاست بجلی گڑھ کی امیر اور پُرانی خاندانی

ریاست کا واحد چشم و چراغ خوبصورت اور دلکش وجیہہ اور باوقار شکار کا شوقین اور خوبصورت عورت کی ادائیں سمجھنے والا۔ خوش لباس اور خوش اطوار۔ نہ اسقدر فیاض کہ صدیوں کی دولت دو دن میں لٹا دے۔ نہ ایسا کنجوس کہ جوہری کی صورت دیکھ کر ہی غش کھا جائے۔!

کنور یاور سنگھ کو بھی جولی بیحد پسند آئی تھی خوبصورتی کے علاوہ کنور یاور سنگھ یورپ کے حکمراں طبقے میں شادی کرنا بیحد پسند کرتا تھا۔ جولی خوبصورت تھی۔ ایک فرانسیسی افسر کی بیوی تھی۔ یورپ کی بہترین ڈپلومیٹک سوسائٹی دیکھے ہوئے تھی۔ خود جولی کا اپنا خاندان کنور یاور سنگھ کے خاندان کی طرح چھ سو برس پرانا تھا۔ جولی فرانس کی پہاڑیوں کی طرح پرانی تھی۔ اسکی انگوری وادیوں کی طرح شاداب اور حسین۔ کنور یاور سنگھ نے جولی پر مرمٹنے کا اعلان کر دیا اور راجکماری نرملا سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جس سے چند دنوں میں اسکی منگنی ہونیوالی تھی۔ جولی اور یاور سنگھ کا شعلۂ عشق چند ماہ ہی میں جنگل کی آگ کی طرح بھڑک اٹھا اور یہ آگ اتنی تیز اور روشن تھی کہ دور سے دیکھنے والے کو بھی نظر آسکتی تھی۔ جولی اور یاور ہر جگہ اکٹھے دیکھے جاتے تھے۔ جولی اور یاور نے منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ مہاراجہ چپل گڑھ نے خود اُنکی منگنی میں شرکت کی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اور عمدہ طریقے سے چل رہا تھا۔ اور اگلی بہار میں اُن دونوں کی شادی ہونے والی تھی۔ جولی بیحد خوش تھی۔ چاروں طرف کھُلا روشن آسمان تھا۔ کہیں پر کالے ابر کا سایہ نہ تھا۔!

پھر ایک سایہ نمودار ہوا۔ چڑیا کی آنکھ کے برابر۔ اولڈ یاٹ کلب میں گھیلا بھائی لٹنانی نمودار ہوا۔ اُسکے کان لاؤڈ سپیکر کے ہارن کی طرح لمبے اور اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ اُسکے ہونٹ لمبے چوڑے اور تھوک سے بھرے ہوئے تھے سانس کی

آنکھیں بیچین ۔ وحشتناک اور چالاک تھیں ۔ ایسی آنکھیں جن کو دیکھ کر لومڑی کا خیال آتا ۔ یا سانپ کا ۔ کبھی کسی جھیل کا خیال نہیں آتا ۔ پانی ٹھنڈے گہرے نیلے کنول کے پھول کھلے ہوئے ۔ لہریں ۔ بچّوں کے تبسم کی طرح کھلا کھلاتی ہوئیں ۔ اس دنیا میں ایسی آنکھیں بہت جلد انسان کے چہرے پر مرجاتی ہیں اور اُنکے بجائے جو آنکھیں آتی ہیں وہ گھیلا بھائی ملتانی کی آنکھوں کی طرح ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر جنگل میں کسی گھرے ہوئے جانور کا خیال آتا ہے۔

گھیلا بھائی ملتانی ایک فلم پروڈیوسر تھا ۔ اور اپنے کروڑپتی فنانسر بچّو بھائی کے ہمراہ مہمان ہو کر یاٹ کلب میں وارد ہوا تھا ۔ بچّو بھائی نے ابھی اُسکی پکچر کے لئے فنانس نہیں کیا تھا ۔ اس لئے ابھی گھیلا بھائی ملتانی بچّو بھائی کی تعریف میں قلابے ملانے پر مجبور تھا ۔ بچّو بھائی اُسکی مجبوری کو سمجھکر ہی اُسے یاٹ کلب میں اپنے ساتھ لے آیا تھا ۔ تاکہ وقت بے وقت اپنی تعریف لوگوں کو سُناتا رہے ۔ گھیلا بھائی ملتانی تعریف کرتا تھا اور بچّو بھائی یوں سُنتا تھا جیسے وہ تعریف کو وسکی کے گلاس میں ڈال کر ہولے ہولے چسکی لے رہا ہو ۔ عمدہ تعریف ہو تو بالکل سکاچ وسکی کی طرح ملایم معلوم ہوتی ہے ۔

مگر گھیلا بھائی ملتانی بیحد چھچھورا بھی تھا ۔ جس ملائمت سے وہ بچّو بھائی کی تعریف کرتا تھا ۔ اُسی شدت سے وہ اُن لوگوں کی مخالفت کرتا تھا ۔ جن سے اُسے کسی طرح کا فیض بہم نہ ہو سکتا تھا ۔

خاص طور پر اُسکی زبان عورتوں کے سلسلے میں بیحد کالی تھی ۔ ایک چھچھورے آدمی کی خاص پہچان یہ ہے کہ وہ کبھی عورت کی عزت نہیں کر سکتا ۔ اور ملتانی زندگی کے جس شعبے سے آیا تھا ۔ وہاں سکیں بوچڑ خانے کے

گوشت کی طرح بکتا تھا۔ اس لئے ملتانی کبھی یہ سمجھ نہیں سکا کہ ایک عورت اور دوسری عورت میں کیا فرق ہے۔ اُس کے لئے سب عورتیں گوشت کے ٹکڑے تھیں۔

"جولی گیسکاں ؟ ۔۔۔ جولی گیسکاں ؟ ؟" ایک روز اُس نے بچّو بھائی کی آدھی بوتل ختم کرنے کے بعد کہا "میں جولی گیسکاں کو اچھی طرح جانتا ہوں ۔ !"

"تم کیسے جانتے ہو۔ ؟ بچّو بھائی نے اُس سے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا "وہ تو تمہیں منہ نہیں لگاتی ۔ !"

"وہ نہ لگائے۔ مگر اُسکے منہ کا مزا تو مجھے معلوم ہے"گھیلا بھائی ملتانی ذرا بلند آواز میں بولا۔

"شش !" بچّو بھائی اور دوسرے لوگ اُس کی ٹیبل کے ارد گرد اِدھر اُدھر متحرک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے "بیہودہ باتیں مت کرو۔ گھیلا بھائی مُلتانی ! وہ سُن لیگی ۔ !"

"سُن لے میں کوئی اُس سے ڈرتا ہوں !" گھیلا بھائی مُلتانی تنک کر بولا "جولی گیسکاں ؟۔ جولی گیسکاں مائی فوٹ ! جولی گیسکاں تو میری فلم میں ایک ایکسٹرا لڑکی کا کام کرچکی ہے۔ آج بڑی نوابزادی بنکر ایک راجہ سے شادی رچانے چلی ہے ۔ مگر ہے تو فلم کی ایک ایکسٹرا لڑکی !"

"تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے ۔ ؟" بچّو بھائی نے دلچسپی لیتے ہوئے ملتانی سے پوچھا۔

ملتانی نے اپنی ٹیبل کے چاروں طرف دیکھا۔ لوگ حیرت اور سکتے میں آگے جھکے ہوئے چاروں طرف سے اُسے دیکھ رہے تھے ۔ اتنی بڑی کلب

میں اتنی امیر اور شاندار کلب میں آج وہ سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ اپنی سانس روکے ہوئے لوگ اُس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سُن رہے تھے۔ ایسا اہم لمحہ گھیلا بھائی ملتانی کی زندگی میں کبھی نہ آیا تھا۔

اُس نے اپنا گلاس ختم کیا۔ مُسکرا کر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اپنا بٹوا نکالا۔ بٹوا نکال کر اُسے بڑی احتیاط سے کھولا۔ اُس میں سے دو تصویریں نکالیں اور حاضرین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولا۔

"یہ لیجئے حضور۔ میرا ثبوت حاضر ہے !"

لوگ ہاتھوں ہاتھ تصویریں لیتے گئے دیکھتے گئے۔ ایک دوسرے کو دیتے گئے۔ واقعی جولی گیسکاں کی تصویریں تھیں۔ ایک فلمی ناچ کے لباس میں۔ دوسری ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی کھڑی تھی۔ وہی جولی گیسکاں۔ جو اب کلب کے ایک کونے میں اپنے منگیتر کنور یاور کے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑے باوقار انداز میں مارٹنی پی رہی تھی۔

لوگ تصویریں دیکھتے اور پھر حیرت سے گھیلا بھائی کو دیکھنے لگتے۔ گھیلا بھائی ملتانی خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا۔ اپنے ہاتھ میں نیا جام لیکر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"گھیلا بھائی ملتانی

"پیش کرتا ہے۔

"جولی گیسکاں کی کہانی !"

اس وقت وہ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے بجّو بھائی نے اُس کی پکچر کیلئے سرمایہ دیدیا ہے۔ پکچر سنسر ہو چکی ہے۔ اور اب فل ہاؤس کے سامنے اُسکی نمائش ہونے والی ہے۔ لہٰذا اُس نے ایک بار پھر چیخ کر کہا۔

"گھیلا بھائی ملتانی
"پیش کرتا ہے
": جولی گیسکاں کی کہانی !!

اُس کے دونوں ہاتھ فخریہ لہجے میں اوپر اُٹھے ہوئے تھے۔ جب ایک زور کا طمانچہ اُس کی گال پر پڑا۔ اور وہ دم بخود ہو کر کرسی پر گر پڑا۔ اور اُس کی چالاک سہمی ہوئی آنکھوں نے دیکھا کہ اُسکے سامنے جولی گیسکاں کھڑی ہے۔ جو اپنے کونے سے اُٹھ کر اُسکے سامنے چلی آئی تھی۔ اُس کا چہرہ غصے سے سُرخ تھا اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اور اُس نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔

پستول کو دیکھتے ہی گھیلا بھائی نے دونوں آنکھیں بند کر لیں اور فوراً بے ہوش ہو کر کرسی کے نیچے گر پڑا۔

اُسی وقت کنور رِیاور سنگھ نے آ کر جولی کے ہاتھوں سے پستول چھین لیا۔ مگر جولی اپنا ہاتھ چھڑا کر فوراً وہاں سے بھاگ گئی۔

دوسرے دن کنور ریاور سنگھ راجکماری نرملا کو لیکر سیلنگ پر چلا گیا۔ اُس کی غیر حاضری میں جولی کلب میں آئی۔ لوگوں نے اُسے دیکھا مگر کسی نے اُس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہاں جب کنور ریاور سنگھ سیلنگ کر کے واپس آیا۔ تو وہ اُسے پانٹوُن برج پر مل گئی۔ راجکماری نرملا تو کترا کر جولی کے قریب سے گزر گئی۔ مگر کنور ریاور سنگھ کا راستہ جولی

نے روک لیا۔
"ہلو۔ ؟"
"ہلو؟ ؟"
"کیا یہ سچ ہے۔ ؟" کنور نے پوچھا۔
"سب سچ ہے" جولی نے بڑی بے خوفی سے جواب دیا۔
"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا"
"کیونکہ تمہارے سماج میں عورت کو غلطی کرنے کا حق نہیں ہے"
"ہاں یہ ٹھیک ہے!" کنور رایاور سنگھ نے سر جھکا کر کہہ دیا۔
"تم بتاؤ اگر میں تم کو بتا دیتی۔ تو کیا تم مجھ سے محبت کرتے۔ ؟"
"محبت تو کرتا مگر دور دور رہ کر۔!"
"اور اب ؟"
"اب میں تمہاری منگنی توڑنے پر مجبور ہوں!"
"کیوں ؟"
"مہاراج کہتے ہیں جس کی فلم لوگ چار چار آنے میں دیکھ سکتے ہیں وہ میرے محل میں کیسے آئے گی ؟ وہ میری بہو کیسے کہلائے گی۔ ؟ اُس سے میرا پوتا پیدا ہوگا۔ ؟"

"جو عورت جنم دے سکتی ہے وہ ماں ہے۔ وہ کسی محل میں بھی راج کر سکتی ہے۔!" جولی نے شعلہ رو ہوتے ہوئے کہا۔ "رہا راجاؤں کا سوال تو ڈارلنگ۔ تمہیں تو یاد ہوگا۔ ہمارے ملک نے اپنے بادشاہوں کو پھانسی بھی دی ہے۔ انہیں معزول بھی کر دیا ہے۔ اُن سے ہوٹل میں بیرہ گیری کروائی ہے۔ اور اُن سے موچی کا کام بھی لیا ہے۔"

"تم میرے باپ کی بے عزّتی کر رہی ہو۔؟" کنور نے زور سے بھڑک کر کہا۔

"نہیں۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔!" جولی نے رُک رُک کر اپنے آنسو روک کر سسکتے ہوئے کہا۔

"میں نے صرف اس لئے اپنی چند برس کی غربت تُم سے چھپائی تھی۔ کہ کہیں تم مجھ سے نفرت نہ کرنے لگ جاؤ۔ حالانکہ اِس نفرت کی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی۔ غریبی تو انسان کا پہلا حق ہے۔!"

"مگر دوسروں کے لئے!" کنور نے اس پوری بحث سے بیزار ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارے اور میرے درمیان اب سب ختم ہے۔ جولی!" کنور نے فیصلہ کُن لہجہ میں کہہ دیا۔

"سینٹ ایلائن کے قصبہ میں ہمارا ایک خوبصورت گھر ہے۔ جس کے پتّھر کے زینے دریائے رائین تک جاتے ہیں۔ آج میرے باغ کی بیلوں میں انگور کے اُودے گچھے مہک رہے ہوں گے۔ میری وادی میں چلو میرے یاور!"

"گڈ بائی جولی!"

"گڈ بائی!"

....

....

اور اب وہ لوگ اُس کی لاش کو لا رہے تھے۔"

جو لوگ اس منظر کی تاب نہ لا سکے انھوں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ کچھ لوگ سر جُھکا کے مؤدب کھڑے ہو گئے۔ اور جوُلی کی لاش کو راستہ دینے لگے۔ جسے چرن سنگھ سٹیوارڈ نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا رکھا تھا۔ اُس کا گلابی بلاؤز اُس کے جسم سے چپک گیا تھا۔ اور سیاہ سبز مخملیں جینز پانی میں بھیگ کر بھی بے حد ٹائٹ تھا۔ اور اُس کے سر کے بال بالکل کھُل گئے تھے اور فرش کے غالیچے تک آ رہے تھے۔ اور اُن میں سے پانی بہہ رہا تھا۔ اور غالیچے کو بھگوتا جا رہا تھا۔ معاً ہر شخص نے گھیلا بھائی ملتانی کو کئی گز کے فاصلے سے اکیلا چھوڑ دیا۔ کوئی شخص اُسکے قریب جانے کو تیار نہ تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہو کوئی خارش زدہ کُتا ہو۔ اس وقت سب کی آنکھیں یاور سنگھ اور راجکماری نِرملا پر لگی ہوئی تھیں۔ جو اندر لاؤنج کے ایک کونے میں سب کی نظروں سے چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ مگر لاش کو لیڈیز کلوک روم میں لے جانے کے لئے سٹیوارڈ کو لامحالہ اندر کے لاؤنج سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس لئے وہ نہایت خاموشی سے جولی کی لاش کو اُٹھائے ہوئے اندر سے گزرتا گیا۔ اور جو جہاں بیٹھا تھا وہیں پتھر کے بُت کی

طرح خاموش بیٹھا رہ گیا۔
کنور یاور سنگھ نے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے چرن سنگھ کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے اُسے جولی کے سُفید سُتے ہوئے چہرے پر گہری سبز آنکھیں کھُلی ہوئی دکھائی دیں۔ دوسرے لمحے میں بالوں کا گھنا جال اُسکے قدموں پر آنسوؤں کی لکیر بناتا ہوا گزر گیا۔
یکایک اُس کے دل میں ایک بھنور سا بھرنے لگا۔ مگر وہ جانتا تھا۔ کہ اس وقت سارے کلب کی نگاہیں اُس پر ہیں۔ اس لئے اُس نے اپنے آپ کو سنبھال کر ہر قسم کے جذبے سے عاری لہجے میں راجکماری نرملا سے کہا۔
"آپ کیا پئیں گی۔ پورٹ یا شیری۔ ؟"
اس سوال پر پروفیسر ملکانی سوچنے لگا۔ کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ ولین ہے ؟ گھیلا بھائی ملتانی یا کنور یاور سنگھ ؟ ؟ جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ تو اُس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "ہم لوگ ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔ !"
مگر جب اُس کے ساتھی نے بھی کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے بھی اپنے سماجی فلسفے کو تہ کر دیا۔ اور موت کے سامنے ایک معمولی بشر کی طرح اپنے سر کو جھکا دیا۔
جب سٹیوارڈ جولی کی لاش کو لئے لیڈیز کلوک روم میں داخل ہوا تو ایک ایک کر کے سب لیڈیز وہاں سے بھاگ گئی تھیں۔ کلوک روم میں اکیلی کاشی بائی رو رہی تھی۔ کیونکہ کلب میں اکیلی وہی عورت تھی جو محبت کا درد سمجھتی تھی۔
سٹیوارڈ نے جولی گیکاں کی لاش کو دیوان پر لٹا دیا۔ پھر ایک

لمبا سانس لے کر کاشی بائی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔
"یہ جولی میم صاحب کو کیا ہوا۔؟"
کاشی بائی نے چند لمحے سٹیوارڈ کو گھور کر دیکھا۔ اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ سٹیوارڈ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی۔ تو اُس نے آہستہ سے افسوس سے سر ہلایا اور دھیرے سے آہ بھر کر کہا۔
"کچھ نہیں سٹیوارڈ! جولی میم صاحب بہت دور سیلنگ کو نکل گئی ہیں!"

فرشتہ

پروفیسر ملکانی کا خیال تھا کہ جس طرح اوپر ہر آسمان پر ایک شیطان رہتا ہے۔ اسی طرح نیچے ہر زمین پر ایک فرشتہ بھی رہتا ہے۔ حالانکہ اب اوپر اور نیچے شیطان اور فرشتے کی تخصیص بہت حد تک ختم ہو چکی ہے۔ آسمان ہماری زمین کے اوپر بھی ہے اور نیچے بھی ہے۔ اور جہاں کبھی شیطان پائے جاتے تھے وہاں اب فرشتے ملتے ہیں۔ اور جہاں صرف فرشتوں کی توقع کی جاتی تھی۔ وہاں اب شیطان نظر آتے ہیں۔ پھر بھی اچھے اور برے بلندی اور پستی کی تخصیص کسی حد تک ہمیشہ باقی رہے گی۔

بورین کلب میں بھی ایک فرشتہ رہتا تھا۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا۔ عورت بازی نہیں کرتا تھا۔ جوا نہیں کھیلتا تھا۔ گالی نہیں بکتا تھا۔ ڈانس نہیں کرتا تھا۔ رمی، برج، سنوکر کسی کھیل کا اسے شوق نہیں تھا۔ کلب کے سب ممبر اس سے انتہائی نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ فرشتہ تھا۔

ایسا فرشتہ کروڑپتی کیسے ہو گیا تھا۔ یہ ایک راز ہے۔ حالانکہ کوئی ایسا پُراسرار راز بھی نہیں۔ کیونکہ ہر کروڑپتی کروڑپتی بن جانے کے بعد اپنے فرشتہ خصلت ہونے کا دعویٰ کیا کرتا ہے۔ مگر سیٹھ مدھوکر نے صرف دعویٰ ہی نہیں کیا تھا بلکہ جو دعویٰ کیا تھا اسے سچ کر کے دکھایا تھا۔

کلب میں سیٹھ مدھوکر کا کردار آج تک بالکل بے داغ تھا۔ ٹھیک ساڑھے چھ بجے وہ ہر روز کلب میں چھڑی گھماتے ہوئے داخل ہوتا تھا۔ اُسکے پیچھے اُسکے دونوں بیٹے شگن اور جگن داخل ہوتے، اُن کے پیچھے اُن کی دونوں بیویاں عمدہ زیور اور عمدہ ساڑھیاں پہنے ہوئے سر کو ساڑھی کے آنچل سے ڈھکے ہوئے نظریں جھکائے ستی ساوتری بنی ہوئی داخل ہوتیں۔ اُنکے بعد دو انتہائی بدصورت اور خونخوار آیائیں پانچ دُھلے دُھلائے بچوں کو لیکر داخل ہوتیں۔ وہ لوگ مغربی لاؤنج کے سب سے مغربی کونے میں بیٹھ جاتے۔ سیٹھ مدھوکر چائے کا آرڈر دیتا۔ بچے چاک بار یا کسی دوسری آئس کریم سے شوق فرماتے۔ دونوں ولیعہد باری باری اور ینج سکوائش پیتے، یا تازہ لائم سوڈے میں ملا کر کاک ٹیل سمجھ کر پی جاتے۔ ہولے ہولے چائے پیتا ہوا سیٹھ مدھوکر اپنے فربہ اندام جسم کو جگہ جگہ سے کھُجاتا ہوا اِس طرح خوش ہو کر چاروں طرف دیکھتا جیسے اُسکے کندھوں پر فرشتوں کے پر اُگ آئے ہوں!

ٹھیک ساڑھے سات بجے یہ پورا خاندان دو گاڑیوں میں لد کر کلب سے واپس گھر چلا جاتا تھا۔ مگر جب تک یہ لوگ کلب میں رہتے تھے۔ اکثر لوگ مغربی لاؤنج میں بیٹھنا چھوڑ دیتے تھے۔ بلکہ اکثر اوقات چالیس پچاس فیٹ آگے پیچھے کی جگہ بھی خالی کر دیتے تھے۔ اُس وقت گفتگو کے سُر مدھم ہو جاتے تھے۔ بلند بانگ بحثیں بیچ میں ہی ختم ہو جاتی تھیں۔ لوگ یا تو اپنی وہسکی کا گلاس اُٹھا کر وہاں سے چلے جاتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے ٹیبل پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہوں تو اِس طرح باقی ماندہ وہسکی ختم کرتے تھے۔ جیسے وہ وہسکی نہیں نیم کا عرق پی رہے ہوں۔ مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو اور ایک فرشتہ سارے کلب کو گندہ کرتا ہے۔ انہی باتوں سے جل کر ایک روز پرنس فیروز نے سیٹھ مدھوکر سے کہا تھا۔

"سیٹھ جی آپ ایسے لوگوں کو اس دُنیا میں نہیں بلکہ اگلی دُنیا میں رہنے کی بہت ضرورت ہے۔ یوں دیکھا جائے تو آپ کو مرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ آپ تو زندہ جیتے جاگتے بہشت میں داخل کئے جا سکتے ہیں۔"

اور سیٹھ مدھوکر ایک معصوم گول دائرہ نما چاروں طرف پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیتا تھا "راجہ جی میں تو اس دنیا میں بلکہ اس کلب میں بھی بہشت لانیکا کا خواب دیکھتا ہوں۔ بھگوان کی بستی تو ضرور اچھی ہوگی مگر بندوں کی بستی ایسی گندی کیوں رہے۔؟

"آخر آپ کو ہمارے کلب میں کیا بُرائی نظر آتی ہے" پرنس فیروز نے پوچھا۔

"سب بُرائیوں کی جڑ شراب ہے" سیٹھ مدھوکر نے اپنے پُرانے موضوع پر آتے ہوئے کہا "شراب پی کر لوگ جُوا کھیلتے ہیں۔ شراب پی کر لوگ گھر سے دو بجے تک باہر رہتے ہیں۔ شراب پی کر......"

یکایک پرنس فیروز نے لقمہ دیا "شراب پی کر لوگ اور شراب پیتے ہیں۔"

"بالکل درست ہے" سیٹھ مدھوکر نے اپنا گھٹا ہوا سر ہلاتے ہوئے کہا "میں اس لئے بمبئی میں پچھلے دس سال سے نشہ بندی کی کوشش کر رہا ہوں جس دن اس کلب کی بار بند ہوگی اُس دن مجھے چین ملے گا۔"

ابھی تک تو آپ کو کامیابی ہوئی نہیں" کنور رلبراج سنگھ نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔

"ہو جائے گی! ہو جائے گی!! تم دیکھتے جاؤ!!!" سیٹھ مدھوکر نے ایک پُراسرار لہجے میں دھمکی دیتے ہوئے کہا "پاپ کا گھڑا ابھی بھر رہی ہے!"

"اور جب پاپ کا گھڑا بھر جائیگا تو پھر کیا ہوگا" رانی صاحبہ جھاؤ نگر نے بے حد شیریں لہجے میں سوال کیا۔

سیٹھ مدھوکر نے پُر امید لہجے میں کہا۔" پھر اِس کلب میں بیر کا کاسک بہا دیا جائیگا۔ وہسکی کی ہر بوتل توڑ دی جائیگی۔ لوگ نشے میں مدھوش ہو کر دوسرے کی بیویوں کے ساتھ ڈانس نہیں کرینگے۔ رات کے چار بجے اپنے گھر نہیں جائیں گے۔ ذرا ذرا سی بات پر بگڑ کر گالی نہیں بکیں گے۔ تاش کے کھیل میں اپنی زندگی کی گاڑھی کمائی نہیں ہاریں گے۔"

پرنس فیروز نے کہا۔ گویا یہاں رم کی بجائے رامائن کا پاٹھ ہوگا۔ سیلنگ کی بجائے ستیہ نارائن کی کتھا ہوگی اور کٹ تھروٹ کی بجائے کیرتن ہوگا۔"

"بالکل... بالکل ایسا ہی ہوگا۔!" مدھوکر نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

پرنس فیروز اور کنور بلراج زور زور سے ہنسنے لگے۔" سیٹھ مدھوکر جی آپ واقعی ایک فرشتہ ہیں۔"

اِس گفتگو کے چند ماہ بعد ہی کنور بلراج سنگھ، پرنس فیروز اور اُنکے دوسرے دوستوں کی ہنسی خوف اور نا اُمیدی میں بدل گئی۔ جب بمبئی میں نشہ بندی کا قانون لاگو ہو گیا۔ آخر وہ دن آگیا جس کا سیٹھ مدھوکر کو جانے کب سے انتظار تھا۔

رات کے بارہ بجے تک کلب میں ممبر شراب پیتے رہے تھے۔ ممبر اور اُن کے دوست اور مہمان مل کر آج رات اتنی شراب پی گئے جتنی وہ سات دن میں بھی نہ پیتے تھے۔ مگر کل صبح سے پروہبیشن (نشہ بندی کا قانون) لاگو ہو رہا تھا۔ اِس لئے آج بار کی ہر بوتل کو خالی کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ کل سے کلب کی بار بند ہو جائے گی۔!

دوسرے دِن یعنی پروہبشن کے پہلے دن سیٹھ مدھوکر ٹھیک ساڑھے چھ بجے چھڑی ہلاتا ہوا۔ اپنے خاندان کے ساتھ کلب کے دروازے میں داخل ہوا۔

آج اُسکے چہرے پر مُسکراہٹ کھلی پڑتی تھی ۔ اُسکے خاندان کی عورتیں بہترین لباس اور زیور پہنکر آئی تھیں ۔ اُن لوگوں کے حُلیے بشرے سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی کسی پک نک پر جا رہے ہیں ۔ اتنے خوش اور مسرور اور شادماں وہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے گئے تھے ۔

کلب کے مختلف لاؤنج سونے پڑے تھے ۔ برآمدوں میں کہیں کہیں ممبر سر جُھکائے چائے پی رہے تھے ۔ کارڈ روم میں ممبر مُنہ بسورتے ہوئے بیدلی سے تاش کھیل رہے تھے ۔ بار روم بالکل خالی تھا ۔ ملازم کونوں میں کھڑے اونگھتے ہوئے دکھائی دیتے تھے ۔ آج مردوں کے چہرے بجھے ہوئے تھے ۔ عورتوں کی ساڑھیوں کے رنگ پھیکے تھے ۔ اور فضا میں ایک سناٹا طاری تھا ۔ لوگ کلب میں اس طرح چل پھر رہے تھے ۔ جیسے کسی بھیانک خواب میں گھوم رہے ہوں ۔ ! اس دن کے لئے سیٹھ مدھوکر نے اتنے برس انتظار کیا تھا ۔ اس لئے آج وہ بیحد خوش تھا ۔ آج کلب کی فضا کیسی بدل گئی تھی ۔ آج ہوا میں الکحل کی بُو نہ تھی ۔ ہوس کی رنگ رلیاں نہ تھیں ۔ شرابیوں کے بے ہنگم قہقہے نہ تھے ۔ عورتوں کی چیخیں نہ تھیں ۔ ملازموں کی بھاگ دوڑ نہ تھی ۔ کیسی پُرسکون متین سنجیدہ فضا تھی کلب کی ۔ جیسے وہ کلب میں نہیں کسی مندر میں چلا آیا ہو ۔ یہی وہ چاہتا تھا ۔ اسی طرح کا کلب وہ چاہتا تھا ۔

آج اُس نے چائے کے ساتھ بہترین کیک اور پیسٹری کا آرڈر دیا ۔ عمدہ سے عمدہ snacks منگوائے ۔ انواع واقسام کی مٹھائیاں اور مشروبات سے کئی میز بھر گئے ۔ آج سیٹھ مدھوکر پھولا نہ سماتا تھا ۔ آج اُسکے دل کی مراد بر آئی تھی ۔ آج وہ قریب سے گزر جانے والے کلب کے ہر ممبر کو اپنی فیملی کے ساتھ چائے پینے کی دعوت دے رہا تھا ۔ کیونکہ آج سارا کلب واقعی پہلی بار ایک

فیملی کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آج سے کلب کے سب لوگ، بڑے سے بڑے لکھے پتی لوگ بھی چائے پئیں گے اور پکوڑے کھائیں گے اور غریبوں کی خدمت کریں گے۔ جے ہند سیٹھ مدھوکر کا جی چاہتا تھا کہ وہ آج کلب کے ہر ممبر کو اپنے گلے سے لگالے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ آج کلب کا ہر ممبر سیٹھ مدھوکر کو اس طرح گھور رہا تھا۔ جیسے وہ اُسکے گلے پر چھُری رکھنے کے لئے تیار ہوں۔ اس لئے سیٹھ مدھوکر نے بعد حسرت و یاس لوگوں سے بغلگیر ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سات بجے کے قریب کلب کا سکریٹری گورنمنٹ سکریٹریٹ سے واپس آیا اُسکے ہاتھ میں کئی ایک کاغذات تھے۔ اُسکے پیچھے کلب کا سٹیوارڈ لکڑی کی ایک چھوٹی سی تختی اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اُسکے پیچھے کلب کے دو مُلازم تھے۔ یہ جلوس بڑھتا بڑھتا بار روم کے بڑے دروازے تک آ کے رُک گیا سٹیوارڈ نے دو ملازموں کو اشارہ کیا۔ اُن لوگوں نے آگے بڑھ کر بڑے دروازے پر لٹکے ہوئے بڑے بورڈ کو اُتار دیا۔ جس پر جلی حروف میں "بار" لکھا ہوا تھا۔ مغربی کونے میں بیٹھے ہوئے سیٹھ مدھوکر نے خوشی سے تالی بجائی مگر کسی نے اُس کا ساتھ نہیں دیا۔ پھر سکریٹری نے سٹیوارڈ کو اشارہ کیا اور سٹیوارڈ نے پالش کی ہوئی لکڑی کی ایک تختی ایک ملازم کے حوالے کی۔ اور ملازم نے تختی لیکر اُسے پرانے بورڈ کی جگہ پر ٹانگ دیا۔

سیٹھ مدھوکر نے تختی کو پڑھا۔ اُس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "پرمٹ روم"

"یہ کیا ہے ؟" سیٹھ مدھوکر اپنی جگہ سے اُٹھ کر سکریٹری کی طرف بڑھ کر پوچھنے لگا۔

"یہ پرمٹ روم ہے۔ حضور والا۔ اس میں بیٹھ کر شراب پی جا سکتی ہے

بشرطیکہ آپ کے پاس پرمٹ ہو۔ سکریٹری نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔
پھر سکریٹری ایک فائیل کھول کر بلند آواز میں کہنے لگا۔
"کلب کے جن ممبروں کے پرمٹ میڈیکل وجوہات کی بنا پر میرے پاس منظور ہو کر آگئے ہیں۔ میں اُن کے نام باری باری پڑھے دیتا ہوں۔ برائے مہربانی اپنا اپنا پرمٹ مجھ سے حاصل کرتے جائیں۔ اور پرمٹ روم میں داخل ہوتے جائیں۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین پلیز پلیز۔ کیو بنا لیجئے۔ میں نام پڑھے دیتا ہوں۔

سیٹھ ایس کے بانگا	ڈھائی بوتل
سیٹھ مدن بانگا	دو بوتل
پرنس فیروز	تین بوتل
کنور بلراج سنگھ	دو بوتل
رانی صاحبہ جھاؤ نگر	ڈیڑھ بوتل
راجکماری ارملا	ایک بوتل
کنور مراتب علی	ڈیڑھ بوتل
سردار جسونت سنگھ	دو بوتل
مس رضیہ عطاءاللہ	ایک بوتل
مہروان جی نصروان جی بھاجی والا	چار بوتل

سکریٹری نام پڑھتا جا رہا تھا۔ کلب کے ممبر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور اپنا اپنا پرمٹ لیکر جلدی سے پرمٹ روم یعنی سابق بار میں داخل ہوتے جا رہے تھے ہولے ہولے پرمٹ روم سے بوتلوں کے کھلنے، جام کے کھنکنے، ملازموں کے بھاگنے اور ممبروں کے قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اور پرانا

بار پرانے دنوں کی طرح سگریٹ کے دھوئیں، الکحل کی بو، اور شرابی فقروں کی گونج سے بھر گیا۔ کمرے میں کچھ اسی طرح نظر آرہا تھا جس طرح ہمیشہ ہوتا تھا۔ صرف دروازے پر لکڑی کی ایک تختی بدل گئی تھی۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب سکریٹری فہرست ختم کر چکا تو اس نے دیکھا کہ ایک ایک کر کے کلب کے سارے ممبر پرمٹ لیکر پرمٹ روم کے اندر چلے گئے ہیں۔ صرف سیٹھ مدھوکر مغربی لاؤنج میں اپنی فیملی کے ساتھ چائے پینے کے لئے اکیلا رہ گیا ہے....

فرشتہ!

POCKET BOOK

۸۵ مشورہ بکس

جو اب تک شائع ہو چکی ہیں

شاعری

دیوان غالب — غالب
عمر خیام کی رباعیاں — پروفیسر واقف
عمر خیام حصہ دوم — پروفیسر واقف
عمر خیام حصہ سوم (عکسی رنگین) پروفیسر واقف
بانگ درا — علامہ اقبال
ضرب کلیم — علامہ اقبال
دیوان داغ — داغ
دیوان ذوق — ذوق
بال جبریل — علامہ اقبال
کلام میر — میر تقی میر
کلام حالی — حالی
انتخاب نظیر — نظیر اکبرآبادی
کلام فانی — فانی بدایونی
دیوان ظفر — ظفر
ارمغان حجاز — علامہ اقبال
رباعیات حافظ شیرازی — جذب
انتخاب سودا — سودا
دیوان مومن — مومن
مسدس حالی — حالی
بھگوت گیتا (منظوم) — منور لکھنوی
رامائن (منظوم) — اشک ایم اے

کلام اقبال — اقبال
کلام امیر مینائی — امیر مینائی
دیوان غالب (عکسی رنگین) — غالب
دیوان ظفر (عکسی رنگین) — ظفر
دیوان درد — خواجہ میر درد

ناول

غدار — کرشن چندر
ایک ہنسی ہزار آنسو — کرشن گوپال عابد
مسافر — کرشن گوپال عابد
پوجا — کرشن گوپال عابد
میرے صنم — زلیخا حسین
آپا — زلیخا حسین
براج بہو — شرت چندر
بڑی دیدی — شرت چندر
کشور — نسیم انہونوی
گمراہ — مضطر ہاشمی
چندن ہار — عادل رشید
چندرما — عادل رشید
اداس تنہائیاں — ٹھاکر پونچھی
انجانے راستے — وحشی محمود آبادی
نشیمن — عابدہ حجاب لکھنوی
جب پتھر روتے ہیں — ٹھاکر پونچھی
ایک شمع ہزار پروانے — ہیندر ناتھ
تیری موت میری آنکھیں — ہیندر ناتھ
بھنور — ٹھاکر پونچھی
یہ رشتے یہ روگ — ٹھاکر پونچھی
کلیوں کا مزار — ٹھاکر پونچھی
خواب — عاشق مارہروی
بربط کے تار — عادل رشید
بساط دل — عادل رشید
چاندنی — عادل رشید
دادر پل کے بچے — کرشن چندر
فنیار — زلیخا حسین
خزاں کے پھول — اقبال جاوید
آخری رات — اختر عادل روپ
بوند اور سمندر — کرشن گوپال عابد
زخم — الیاس گدی
بکھر گئے سپنے — نظمی صدیقی

جاسوسی ناول

ابوالہول کی روح — اکرم الہ آبادی
منحوس ستارہ — ″
ریڈیائی دھماکے — ″